فارسی میں جو رتبہ حافظ
وہی اُردو میں ہے مقامِ وفا

— آثر لکھنوی —

مقامِ وفا

رام رتن مضطر

ناشر	رام رتن مضطر
مطبع	جمال پرنٹنگ پریس۔ دہلی
اشاعت اوّل	اکتوبر ۱۹۸۲ء
تعداد	چارسو
کاتب	محمد الیاس۔ سکندر آباد۔ یوپی
قیمت	پچیس روپئے

ملنے کا پتہ

قصرِ اردو۔ اردو بازار۔ جامع مسجد۔ دہلی ۶

آزاد بُک ڈپو۔ ہال بازار۔ امرتسر (پنجاب)

ترتیب

حصہ اوّل

حصّہ دوم

حصّہ سوم

مرحومہ و مغفورہ بیوی

کے نام

کچھ اِس کتاب کے بارے میں

کوئی تین چار سال ہوئے میرے دل میں خیال آیا کہ قبلہ اُستاد پنڈت میلا رام وفاؔ کے سوانح حیات اور اُن کی شاعری پر کچھ لکھوں۔ میرے اس خیال کے دو محرّک ہیں۔ اوّل یہ کہ وفاؔ صاحب پر آج تک بہت کم ناقدانِ سخن نے توجہ مبذول فرمائی ہے۔ اس لئے اُردُو شاعری میں ان کے مقام و مرتبہ کا صحیح تعین نہ ہو سکا۔ بعض معاصرین نے اپنی بساط کے موافق وفاؔ صاحب کی قدردانی کی ہے۔ بلیغ الملک مولانا تاجورؔ مرحوم نے جو ایک عالی مرتبہ شاعر۔ ادیب اور صحافی تھے وفاؔ صاحب کی شاعرانہ عظمت و شان کا جا بجا اعتراف کیا ہے۔ اس کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں جو خود ایک بلند پایہ اخبار نویس ہونے کے علاوہ پُرگو اور خوش فکر شاعر بھی تھے وہ بھی وفاؔ صاحب کی نظم و نثر کے مدّاح تھے۔ مولانا نیاز فتحپوری نے جو ایک نہایت سخت گیر نقاد واقع ہوئے ہیں اور جن کی کڑی نکتہ چینی سے حسرتؔ۔ فانیؔ۔ اصغرؔ۔ جگرؔ۔ فراقؔ۔ جیسے مشہور و معروف شاعر بھی بچ نہ سکے وفاؔ صاحب کے تغزل کی دل کھول کر داد دی ہے۔ گویا اس طرح اہلِ نظر کا ایک محدود حلقہ ہے جو وفاؔ صاحب کی عظمت و اہمیت کو محسوس کرتا ہے لیکن ناقدین کے بڑے گروہ نے ان کی شاعری پر وہ توجہ صرف نہیں کی جس کی وہ حق دار ہے۔

دوسرا محرک یہ تھا کہ استادِ محترم کے تئیں اہلِ نقد و نظر کی اس بے اعتنائی و بے التفاتی کی تلافی کے لیے میں بطور شاگرد ان کے بارے میں اپنی مقدور کے مطابق کچھ لکھ کر حقِ شاگردی ادا کروں۔ لیکن جب میں غور سے سوچتا کہ اس عظیم کام کے لیے میں کیا اور میری بساط کیا تو میرا حوصلہ پست ہو جاتا۔ میں نے ابھی تک اردو نثر میں کبھی کوئی لمبی چوڑی سنجیدہ تحریر نہیں لکھی تھی۔ مجھے ایک طرح کی جھجک تھی۔ سو عملی طور پر کافی دیر تک میں کچھ نہ کر پایا۔ لیکن یہ خیال بدستور میرے دماغ میں گھومتا رہا اور اس خیال کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ چنانچہ اسی ادھیڑبن میں دو اڑھائی سال گذر گئے۔ لیکن میرا ارادہ رفتہ رفتہ پختہ ہوتا گیا کہ میں اپنی کمزوریوں کے باوجود یہ سعادت حاصل کروں گا۔ آخر اس مہم کی ابتدا ایک مضمون بعنوان "پنڈت میلارام وفا۔ ایک شاعر اور صحافی" سے ہوئی جو ماہنامہ "پاسبان" چنڈی گڑھ کے شمارہ نومبر ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ ازاں بعد ایک اور مقالہ "وفا صاحب غزل گو کی حیثیت سے" سپردِ قلم ہوا جو اسی میگزین کی اشاعت بابت ماہ اپریل ۱۹۷۹ء میں چھپا۔ اس طرح یہ دو مضمون چھپنے میں چھ ماہ گذر گئے۔ دراصل میرا پلان یہ تھا کہ ماہ بہ ماہ یا ہر دوسرے مہینے ایک مضمون لکھ کر رسالہ ہذا میں چھپوا لیا کروں گا اور اس طرح جب آٹھ دس مضمون اکٹھے ہو جائیں گے تو انہیں کتابی صورت میں نکال دوں گا۔ مگر مجھے یہ جان کر مایوسی ہوئی کہ "پاسبان" ایک سرکاری آرگن ہونے کے باعث کسی ایک مصنف کو ہر ماہ متواتر شائع نہیں کر سکتا۔ اس لیے میں نے اس پرچے کا سہارا لینا ترک کر دیا۔ اور اس کے بغیر آگے بڑھنے کا عزم بالجزم کیا۔

تیسرا مضمون جو اس کتاب کا چوتھا باب بنا بڑی محنت اور کاوش کے بعد تیار ہوا اس میں ایک تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا۔ چند باکمال استادوں کی زمینوں میں وفا صاحب کی ہم طرح غزلیں فراہم کی گئیں۔ اس مطلب کے لئے اساتذۂ کرام میں سے آتش۔ مومن۔ غالب۔ ذوق اور داغ کو منتخب کیا گیا۔ ان کے دواوین کی خوب ورق گردانی کی اور کچھ غزلیں چنی گئیں پھر وفا صاحب کی ہم طرح غزلیں ان کے بالمقابل دی گئیں اور یہ امر ملحوظ رکھا کہ کسی شاعر کی کسی غزل پر کسی قسم کی کوئی نکتہ چینی نہ کی جائے بلکہ یہ کام قارئین کے حسنِ ذوق پر چھوڑ دیا جائے تاکہ اس تقابلی مطالعہ سے وہ خود فیصلہ کر سکیں کہ اردو شاعری کی دنیا میں وفا صاحب کا کیا مقام ہے۔

پھر کچھ دیر کے بعد ایک اور مقالہ "وفا صاحب کی نظم نگاری" کے عنوان سے لکھا۔ اس کے بعد یہ کام پہلے ہی دھیرے دھیرے چل رہا تھا اچانک رک گیا۔ بدقسمتی سے بیوی فرش پر گر پڑیں اور ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ تین چار ماہ ہسپتال میں داخل رہنے کے بعد آخر ۲۶ جنوری ۱۹۸۰ء کو انتقال کر گئیں۔ نتیجہ کے طور پر اس المیہ سے سات آٹھ ماہ کے لئے کام معطل رہا۔

میری تجویز تھی کہ اس کتاب کا ایک باب وفا صاحب کے شاگردوں کے لئے مخصوص کیا جائے جس میں جملہ تلامذہ کے مختصر حالاتِ زندگی، نمونہ کلام اور ان کے کلام پر استاد کی اصلاحیں دی جائیں۔ چنانچہ گذشتہ فروری کے آخری دنوں میں تمام استاد بھائیوں کی خدمت میں ایک گشتی مراسلے کی صورت میں چٹھی لکھی گئی۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ماسوائے سر وشری راجن سرحدی۔ جگنو توی اور آخر ہر لو اسیلد صیا نہ کوئی صاحب

مطلوبہ کوائف مہیا کرنا تو درکنار میری چٹھی کا جواب تک دینے کا بھی روادار نہ ہوا۔ چنانچہ بادلِ ناخواستہ مجھے اپنی تجویز خود ہی رد کرنی پڑی۔

اُستاد کی اصلاحیں دنیا میں نہایت ضروری خیال کرتا تھا۔ کیونکہ ان سے اُستاد کی قادرالکلامی اور عظمت کا سراغ ملتا ہے اور اُن کی نکتہ شناسی اور باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس لئے میرے اپنے کلام ہی پر جو اصلاحیں وقتاً فوقتاً اُستاد نے دی تھیں میں نے فراہم کر کے کتاب کا ساتواں باب مرتب کیا۔

وفاؔ صاحب کے تنقیدی شعور کی مزید وضاحت کے طور پر اُن کے تنقیدی مضامین کا ایک سلسلہ جو نو مضامین پر مشتمل ہے ماہنامہ "جاں نثار" امرتسر سے نقل کر کے علیحدہ آٹھویں باب میں "آئینۂ سخن" کے تحت دیا گیا۔ یہ مسلسل مضامین اگست ۱۹۶۹ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک رسالہ "جاں نثار" کے مختلف پرچوں میں بکھرے پڑے تھے۔ ایڈیٹر "جاں نثار" شری رام لال بھنڈاری نے ازراہ نوازش ان تمام مضامین کے نقل کرنے کی مجھے سہولیات بہم پہنچائیں اس کے لئے میں محترم بھنڈاری صاحب کا سپاس گزار ہوں۔

کتاب کی افادیت بڑھانے کی غرض سے نویں باب میں وفاؔ صاحب کا وہ تمام کلام دیا گیا جو اُنہوں نے "سنگِ میل" کی اشاعت کے بعد میں کہا۔ اس کے ساتھ دسویں باب میں "سنگِ میل" کا انتخاب دیا گیا۔ اِس لحاظ سے یہ کتاب وفاؔ صاحب کی کلیات بھی کہی جا سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ سخن شناس حضرات کے لئے یہ دونوں باب بے حد دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ اگر کسی صاحب کو کتاب کے پہلے سات باب کسی طرح پسند نہ آئیں تو بھی آٹھواں، نواں اور دسواں باب لازماً اُس کی توجہ

اپنی طرف کھینچیں گے۔ کتاب کے پہلے سات ابواب میں ایک ارادتمند شاگرد کے ہدیہ عقیدت کے سوا زیادہ کچھ پیش کرنے کا مجھے کوئی دعوےٰ نہیں۔

وفاؔ صاحب پر میری یہ تصنیف یقیناً حرف آخر کی حیثیت نہیں رکھتی۔ تاہم میں اتنا ضرور سمجھتا ہوں کہ وفاؔ صاحب پر آیندہ کام کرنے والوں کے لئے یہ مفید و مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔

پہلا اور چھٹا باب سب سے آخر میں لکھے گئے۔ پہلا باب وفاؔ صاحب کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان کے وہ تمام حالاتِ زندگی درج کئے جائیں جن سے اُن کی سیرت اور شاعری کا مطالعہ کرنے میں مدد ملے۔ چھٹا باب دراصل اُن کی شاعری کا ایک مجموعی تاثر ہے یعنی اُن کے کلام کا اجمالی جائزہ۔

آخری باب کتابیات کا ہے۔ اِس میں اُن تمام کتابوں۔ دواوین اور رسالوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے میں نے اس کتاب کی تیاری میں ہر مشکل مرحلہ پر مدد لی ہے اور بھرپور استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ میں ان کتب کے زندہ و مرحوم مصنفین کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

۷ ستمبر ۱۹۸۰ء   رام رتن مضطر

یہ کتاب وفاؔ صاحب کی موت سے کوئی پندرہ بیس روز پہلے مکمل ہو چکی تھی۔ لیکن افسوس کہ مجھے کتاب کے بارے میں اُن سے آخری صلاح و مشورہ کرنے کا موقعہ نہ ملا۔ میں خیال ہی کرتا رہ گیا کہ آج جاتا ہوں کل جاتا ہوں جبکہ ۲۹ ستمبر ۱۹۸۰ء کی شام جالندھر ریڈیو سٹیشن پر خبر آگئی کہ اچانک دل کی حرکت بند ہو جانے سے آج صبح راج کوی لسان الاعجاز

پنڈت میلارام وفاؔ اِس جہانِ فانی سے راہیِ ملک بقا ہو گئے۔ دل کو دکھ ہوا کہ میں اُن کے آخری درشن نہ کر سکا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُن کا خاتمہ اتنا قریب ہے چنانچہ ان کی وفات حسرت آیات نے جو فی الفور حالت بدل دی اس کے پیشِ نظر کتاب میں کچھ رد و بدل کرنا ضروری ہو گیا خاص کر کے کتاب جو بیشتر زمانہ حال میں لکھی گئی تھی اب فعل ماضی میں بدلنی پڑی اور اِس طرح شروع سے آخر تک کتاب پر نظر ثانی کرنی پڑی۔

رام رتن مضطرؔ

۱۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء
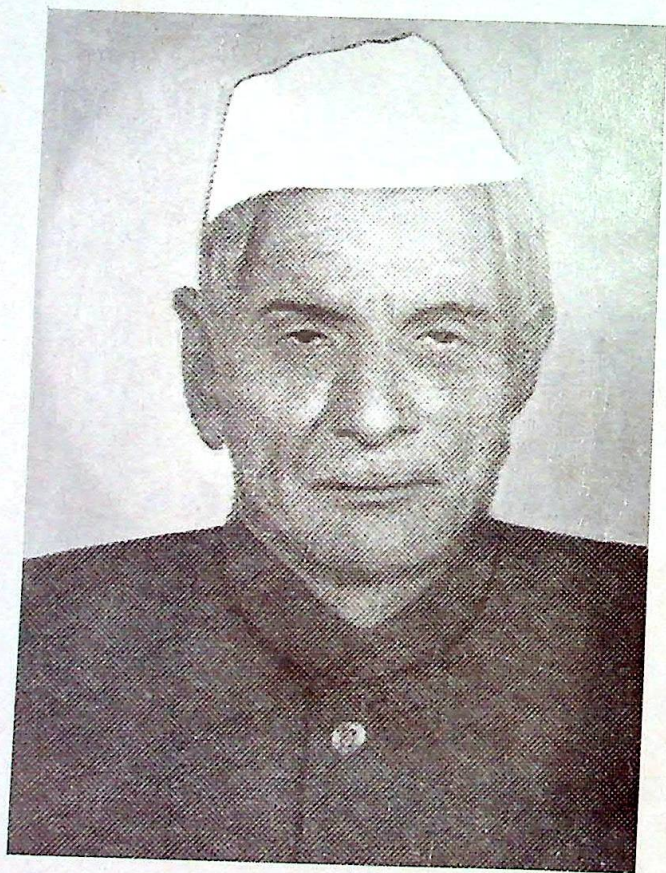
پہلا باب

سوانح حیات

پس منظر!

بیسویں صدی کے آغاز میں انڈین نیشنل کانگرس کی طاقت میں حیرت انگیز اضافہ ہوگیا بالخصوص تقسیم بنگال نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ملک بھر میں غم وغصہ کی لہر دوڑ گئی ۱۹۰۶ئ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس نے "نان کوآپریشن" اور "سودیشی" کی تحریکیں چلانے کا فیصلہ کیا۔ انگریزوں کی تباہ کاریوں اور چیرہ دستیوں نے لوگوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا کردی۔ غیر ملکی حکومت کا جوا اُتار پھینکنے کا خیال پیدا ہوا۔ اصلاحی اور سیاسی تحریکوں نے قومیت کے شعور اور آزادی کی خواہش کو ہوا دی۔ ریل۔ تار۔ ڈاک اور دیگر مادی وسائل وغیرہ امور سیاسی وحدت کا تصور پیدا کرنے میں معاون ہوئے۔ ایک طرف وطن کے سیاسی تصور میں وسعت پیدا ہو چکی تھی اور دوسری طرف حب الوطنی کا تصور نسبتاً زیادہ واضح ہو گیا تھا کانگرس کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے سرکاری حلقوں میں خدشات پیدا ہونے لگے۔ کانگرس کی انگوں سے سامراجی حکومت کو بغاوت کی بو آتی تھی جب مہاتما گاندھی کانگرس کی تحریک آزادی میں شامل ہوگئے تو آزادی کی جنگ۔ ایک نئے دور میں

داخل ہوئی۔ گاندھی جی کی قیادت میں کانگرس ملک گیر عوامی تحریک بن گئی۔ کانگرس ایک خالص قومی ادارے کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ کانگرس نے شروع ہی سے اٹک سے کٹک تک۔ اور کنیا کماری سے کشمیر تک ملک کو ایک مانا اور تمام فرقوں، ذاتوں اور مذہبوں کے پیروؤں کو ہندوستان کا باشندہ تصور کیا۔

دوسری طرف مسلم لیگ کی جانب سے مسلم قومیت اور فرقہ وارانہ سیاست کے رجحانات کو بہت تقویت ملی مسلم لیگ کے پرچار سے ہندو مسلم اتحاد خطرے میں پڑ گیا اور متعدد بار ملک کے مختلف حصوں میں فرقہ وارانہ فسادات برپا ہوئے۔ انگریز حکمران اس صورتِ حال کو اپنے سامراجی منصوبوں کے لئے منفعت بخش خیال کرتے تھے۔ چنانچہ وہ براہ راست یا بالواسطہ مسلم لیگ کو شہ دیتے تھے۔ معدودے چند قوم پرست مسلمان متحدہ قومیت کے لئے تادمِ زلیست کوشش کرتے رہے۔ لیکن مسلم لیگ فرقہ پرستی اور دو قومی نظریہ پر مضبوطی سے جمی رہی۔ ابن الوقتی سے کام لے کر مسلم لیگ کبھی کبھی کانگرس کے ساتھ اتحاد کر لیتی۔ لیکن کار براری کے بعد پھر فرقہ پرستی کے غار میں جا گرتی۔ فرقہ واریت کے جذبات لیگ کی سرکردگی میں اسی طرح ترقی پاتے رہے اور بالآخر ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کا موجب ہے۔

خاندان

موضع دیپو کے تحصیل ظفروال ضلع سیالکوٹ میں بھاردولج گوتر کا ایک براہمن خاندان رہتا تھا۔ یہ گھرانا اپنی خوشحالی اور فارغ البالی کے باعث علاقہ بھر میں عزت واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا ساہوکارہ

اس گھرانے کا خاص دھندا تھا۔ مگر اس کے علاوہ یہ لوگ دکانداری اور کاشتکاری بھی کرتے تھے۔ ان دھندوں میں خاندان کے سب افراد اپنی اپنی جگہ مصروف کار رہتے تھے اور ارد گرد کے دیہات میں اس خاندان کا رعب و دبدبہ خوب جما ہوا تھا۔ وفا صاحب کے دادا پنڈت جیا رام اگرچہ ان پڑھ تھے لیکن خاندانی اثر و رسوخ اور ذاتی اوصاف کی وجہ سے ظفر وال کی ٹاؤن کمیٹی کے ممبر نامزد کئے گئے تھے۔ ظفر وال دیپو کے سے کوئی سات میل کی دوری پر چار پانچ ہزار کی آبادی کا قصبہ ہے اور تحصیل کا صدر مقام بھی۔

ولادت

پنڈت میلا رام وفا ۲۵ جنوری ۱۸۹۵ء کو اس گاؤں دیپو کے میں پنڈت بھگت رام کے ہاں پیدا ہوئے اُس وقت کے رواج کے مطابق یہ مشترکہ خاندان تھا۔ وفا صاحب پانچ بھائی تھے اور ان کے والد ماجد تین بھائی تھے۔ پنڈت بھگت رام پنڈت جے داس کے منجھلے بیٹے تھے۔ گھر میں ہوہی کرنا دھرتا تھے۔ یہ گاؤں ضلع کے صدر مقام سیالکوٹ کے جنوب مشرق میں کوئی چوبیس پچیس میل کے فاصلے پر ہے۔ تاریخی لحاظ سے یہ گاؤں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ برسوں تک لوازمات تہذیب سے کوسوں دور رہا۔ بقول مولانا تاجور مرحوم اگر وہاں تار دیا جاتا تو عام ڈاک کے بھی بعد پہنچتا۔

شجرہ نسب ص ۱۶ پر ملاحظہ کریں

سورج پرکاش متوفی

گایتری دختر — سبھاش چندر — سرلیش کمار — ساوتری دختر

بچپن اور تعلیم

وفا صاحب چھ سات سال کے ہوئے تو کھیتی باڑی اور دکانداری کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنے بڑے بزرگوں کا ہاتھ بٹاتے۔ اکثر مال مویشی چرانے کے لئے باہر کھیتوں میں لے جاتے۔ گھاس کاٹتے اور ڈنگر ڈھوروں کے لئے چارہ مہیا کرتے۔ مویشیوں کو پانی پلاتے اور نہلاتے۔ اب گھر والوں نے خیال کیا کہ وہ سکول جانے کے قابل ہو گئے ہیں چنانچہ دیپوکے سے تین میل دور قصبہ تونار تحصیل پسرور کے پرائمری سکول میں داخل کرا دیئے گئے۔ وہاں سے پہلی اور دوسری جماعت پاس کی۔ اس کے بعد اپنے ننھیال قلعہ صوبہ سنگھ میں تعلیم پانے کے لئے بھیجے گئے۔ ان کا بڑا بھائی سنت رام بھی وہاں ہی اپنی بیوہ مامی کے پاس رہتا اور پڑھتا تھا۔ وفا صاحب وہاں سے ۱۹۰۷ء کے آغاز

میں پرائمری کا امتحان پاس کر کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول پسرور میں داخل ہو گئے اور یہاں انہوں نے نویں جماعت تک تعلیم پائی۔ اس کے بعد یہ سیالکوٹ چلے گئے اور سکاچ مشن ہائی سکول میں داخل ہو گئے جہاں سے انہوں نے سنہ ۱۹۱۲ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔

ہونہار بروا

وفا صاحب بچپن ہی سے بڑے ذہین اور ہونہار تھے۔ ہر امتحان میں اوّل آتے تھے۔ اپنی محنت کی وجہ سے نہیں بلکہ خداداد ذہانت کی بدولت۔ وہ پیدائشی شاعر تھے اور چھوٹی عمر ہی میں شعر کی ساخت اور وزن جاننے لگ گئے۔ چنانچہ جب پرائمری سکول میں تمام بچے اکٹھے ہو کر صبح کے وقت دعائیہ نظم گاتے تو وفا صاحب اس نظم کو مشق کرتے۔ اس نظم کے کئی مصرعے وزن سے خارج تھے اور اس کے علاوہ کچھ تلفظ کی بھی غلطیاں تھیں۔ یہ نظم اسی سکول کے اوّل مدرس کی تصنیف تھی۔ وفا صاحب کی طرف سے ہر روز اس نظم کا اس طرح مذاق اڑایا جانا انہیں ناگوار گزرا۔ اور آخر ایک دن انہوں نے وفا صاحب کی "مولا بخش" سے خوب تواضع کی۔ یہ غالباً سنہ ۱۹۰۶ء کی پہلی سہ ماہی کا واقعہ تھا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ایک قریبی ورنیکولر مڈل سکول کے ہیڈ ماسٹر مولوی محمد منیر اپنے کسی رشتہ دار کو ملنے کے لئے قلعہ صوبہ سنگھ آئے۔ وہ فارسی کے جیّد عالم اور اردو کے پختہ مشق شاعر تھے۔ اور اس حیثیت سے ضلع بھر کے تعلیمی حلقوں میں امتیازی شہرت رکھتے تھے۔ اوّل مدرس بھاگ سنگھ کی دعوت پر وہ سکول میں تشریف لائے۔ اس وقت سب لڑکے دعا خوانی کے لئے صف بستہ کھڑے تھے۔ مولوی صاحب بھی استاد صاحبان کے ساتھ کھڑے ہو گئے۔ وہ شروع سے آخر تک بڑی توجہ کے ساتھ نظم سنتے رہے جب دعا خوانی ختم ہوئی

تو وہ اول مدرس صاحب کو الگ لے گئے اور انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ دعا کے لیئے یہ نظم نہ پڑھوایا کریں بلکہ اس کی بجائے کوئی اور دعائیہ نظم منتخب کر لیں کیونکہ اس میں وزن اور زبان کی فاش غلطیاں ہیں۔ انہوں نے جو غلطیاں بتائیں وہ لگ بھگ وہی تھیں جو طالب علم میلا رام نے بیان کی تھیں۔ اس پر اول مدرس کو بڑا تعجب ہوا۔ انہوں نے مولوی صاحب کو مختصراً مار پیٹ کا وہ ناخوشگوار واقعہ سنایا۔ مولوی صاحب یہ سن کر حیران ہوئے۔ ان کے کہنے پر کمسن طالبِ علم میلا رام کو دفتر میں بلایا گیا۔ لڑکے کی زبان سے وہی غلطیاں سُن کر مولوی صاحب بہت خوش ہوئے اور اُن کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا کہ یہ لڑکا ایک دن بڑا بلند پایہ شاعر ہوگا اور دنیائے شاعری میں بڑا نام پائے گا۔

ملازمت اور اخبار نویسی!

۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کر کے وفا صاحب لاہور چلے گئے اور ریلوے کے صدر دفتر میں ملازم ہو گئے۔ لیکن چار پانچ مہینے کے بعد طبیعت اُکتا گئی اور ایسی اُکتائی کہ پھر کبھی سرکاری ملازمت کرنے پر مائل نہ ہوئے۔ اِن دنوں لاہور میں منشی رام چھپال سنگھ شیدا دہلوی کے زیرِ ادارت اور صوبہ گیر شہرت کی کانگرس لیڈر چودھرانی سرلا دیوی کی زیرِ ملکیت "دیپک" نام کا ایک نیا اردو روزنامہ جاری ہوا۔ وفا صاحب کو اس کے ایڈیٹوریل سٹاف میں جونیئر مترجم کی آسامی مل گئی۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد یہ سخت بیمار ہو گئے اور اپنے گاؤں چلے گئے جہاں دو مہینے سے زیادہ صاحبِ فراش رہے۔ بیماری کے دوران میں انہیں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خیال آیا۔ چنانچہ یہ ماہ ستمبر ۱۹۱۴ء میں لاہور جا کر فارمن کرسچین کالج میں داخل ہو گئے۔

لیکن گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے سلسلۂ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اور ایک ہی سال کے بعد کالج چھوڑ کر اس زمانہ کے مقتدر اُردو روزنامہ "دلیش" میں بطور اسسٹنٹ ایڈیٹر کام کرنے لگے۔ اس اخبار کے ایڈیٹر مشہور و معروف ماہرِ فن اخبار نویس لالہ دینا ناتھ حافظ آبادی تھے اُن کے فیضِ تربیت سے انہیں بھی اس فن میں غیر معمولی مہارت حاصل ہوگئی اور آگے چل کر دنیائے صحافت میں ان کی شاندار کامیابیوں کا موجب بنی۔ روزانہ "دلیش" کے ساتھ اِن کے تعلق کا سلسلہ جولائی ۱۹۱۹ء تک جاری رہا زیادہ کام کاج کرنے کی وجہ سے ان کی صحت پر بُرا اثر پڑا اور آنکھیں بھی خراب ہوگئیں۔ اس لئے استعفٰے دے کر یہ اپنے گاؤں چلے گئے۔ مگر پانچ ماہ کے بعد دسمبر کے آخری ہفتہ میں کانگرس کا ہنگامہ خیز اجلاس دیکھنے امرتسر آئے تو گاؤں واپس جانے کے بجائے عازم لاہور ہو گئے۔ وہاں انہیں متعدد اخبارات سے جن میں روزانہ "دلیش" بھی تھا گھر پر کام کرنے کے لئے مل گیا۔ ۱۹۲۰ء کے نصف اوّل میں شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے جو پانچ چھ سال سے امریکہ میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے ہندوستان میں واپس آگئے اور انہوں نے ۱۹۲۱ء میں ایک لمیٹیڈ کمپنی کے زیرِ اہتمام اور اپنے زیرِ ادارت اُردو کا روزانہ اخبار "بندے ماترم" جاری کیا۔ چند ہفتوں کے بعد وفا صاحب اس کے ایڈیٹوریل سٹاف میں شامل ہو گئے لیکن چار پانچ مہینے ہی کام کرنے پائے تھے کہ صحت خراب ہو گئی دوپہر سے شام تک ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ ڈاکٹروں نے تپ دق کا شبہ ظاہر کیا۔ اس لئے ملازمت چھوڑ کر خانہ نشین ہو گئے۔ کئی مہینے مسلسل علاج سے صحت تو بحال ہو گئی لیکن جسمانی کمزوری روزانہ اخبار کے کام کا بوجھ اٹھانے میں مانع تھی۔ لالہ لاجپت رائے کے ایماء سے جو خود تحریک عدم تعاون کے

سلسلہ میں جیل جا چکے تھے وفا صاحب کو نیشنل کالج لاہور میں جو سرکاری اور سرکار کے منظور کردہ سکولوں اور کالجوں کو چھوڑنے والے طلبا کے لئے جاری کیا گیا تھا اُردو فارسی پڑھانے پر مامور کر دیا گیا۔ یہ فروری ۱۹۲۲ء کی بات ہے "بندے ماترم" کے ایڈیٹروں کی گرفتاریوں کا چکر جاری تھا۔ لالہ جی نے چوتھا جانشین وفا صاحب کو منتخب کیا اور یہ کالج چھوڑ کر "بندے ماترم" کے ایڈیٹر بن گئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کے آتش بار آرٹیکلوں کی دھوم مچ گئی۔ لیکن ۱۹۲۳ء کے اخیر میں اخبار کی پالیسی کے سوال پر لالہ جی سے ان کا اختلاف ہو گیا اور یہ ایڈیٹری سے مستعفی ہو گئے۔ لالہ جی نے جیل سے رہائی کے کچھ عرصہ بعد ہندو مہا سبھا کی صدارت قبول کر لی مگر وفا صاحب اپنے قلم کو کانگرس کے خلاف استعمال کرنے کو تیار نہ تھے۔

"بندے ماترم" سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد انہوں نے فروری ۱۹۲۴ء میں اپنا روزانہ اخبار "بھارت" جاری کیا۔ اگرچہ سرمایہ کی کمی کے باعث یہ اخبار فیل ہو گیا اور آٹھ مہینے کے عرصے میں ان کا اندوختہ ختم کرنے کے علاوہ انہیں ۲۵، ۳۰ ہزار روپیہ کا زیر بار بھی کر گیا۔ لیکن اس کی بدولت سناتن دھرم جگت میں سیاسی بیداری کی جو لہر پیدا ہوئی اُس سے ایک طرف کانگرس کی تحریک آزادی کو نمایاں تقویت پہنچی تو دوسری طرف ہندو مہا سبھا کی طاقت کو بڑا ابھاری دھکا لگا۔ ۱۹۲۵ء میں ان کی کوششوں سے "بھارت" کی جگہ ایک لمیٹیڈ کمپنی کے زیر اہتمام اور مہامانیہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے زیر سرپرستی سناتن دھرمیوں کا روزانہ اخبار "بھیشم" جاری ہوا اور قدرتی طور پر وفا صاحب اس کے ایڈیٹر بنائے گئے۔ ان کے زورِ قلم کی بدولت "بھیشم" کو تھوڑے ہی دنوں کے اندر روزانہ اخبارات میں ممتاز پوزیشن حاصل ہو گئی۔

"بھیشم" کی جگہ مالویہ جی کی ۔ ۔ ۔ ۔ زیر سرپرستی ۱۹۲۹ء میں 'ویر بھارت' معرضِ وجود میں آیا۔ اور وفا صاحب اس کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ اس وقت کانگریس کی تحریک آزادی پورے جوبن پر تھی اور انقلاب پسندوں نے لالہ لاجپت رائے کے خون کا بدلہ لینے کے لئے پولیس کے انگریز سپرنٹنڈنٹ کو قتل کر دیا۔ اس قتل کے الزام میں شہید اعظم بھگت سنگھ اور ان کے دوسرے ساتھیوں کو پھانسی کی سزا ہوئی۔ ان واقعات سے آزادی کی تحریک اور بھی زور پکڑ گئی۔ وفا صاحب نے بغاوت آمیز اور بغاوت انگیز نظموں کا ایک سلسلہ اپنے اخبار میں شروع کر دیا۔ ۱۹۳۱ء میں وفا صاحب نے "ویر بھارت" کا ایک روزانہ ایڈیشن سیالکوٹ سے بھی جاری کر دیا۔ اس طرح اُردو اخباری دنیا میں بیک وقت دو مقامات سے شائع ہونے کا فخر بھی سب سے پہلے وفا صاحب کے اسی اخبار 'ویر بھارت' کو نصیب ہوا۔ ۱۹۳۲ء میں بلاوجہ اخبار 'ویر بھارت' سے تین ہزار روپیہ کی ضمانت طلب کی گئی۔ وفا صاحب زرِ ضمانت داخل کرانے کی بجائے اخبار کی اشاعت بند کر دینے کے حق میں تھے۔ مگر ویر بھارت ٹرسٹ نے اس خیال سے اتفاق نہ کیا۔ اس لئے انہوں نے اخبار سے قطع تعلق کر لیا۔ "ویر بھارت" کا سیالکوٹ ایڈیشن چونکہ ان کی ذاتی ملکیت تھا لہٰذا وہ بٹوارے تک جاری رہا۔ دس سال کے بعد اگست ۱۹۴۲ء میں وفا صاحب پھر "ویر بھارت" سے منسلک ہو گئے اور قریباً پانچ سال یعنی بٹوارے تک "ویر بھارت" میں رہے۔

تقسیمِ وطن کے بعد!

بٹوارے کا اعلان ہونے کے بعد یہ لاہور سے جگندر نگر چلے گئے۔ تین چار ماہ کے بعد یہ اہلِ کنبہ کو پالم پور لے آئے اور وہاں اُن کی رہائش کا انتظام کر کے جالندھر آ گئے۔ نومبر میں اہلِ کنبہ بھی یہیں آ ملے۔ جالندھر میں انہوں نے

ایک روزانہ اخبار جاری کرنے کے لئے درخواست دے رکھی تھی جو دو مہینے کا عرصہ گزر جانے کے باوجود منظور ہو کر واپس نہ آئی۔ دل برداشتہ ہو کر کنبے سمیت سہارنپور چلے گئے وہاں سے "پنجاب میل" روزانہ اخبار جاری کرنے کے لئے ڈیکلریشن داخل کیا۔ لیکن چند ناگزیر مجبوریوں کے باعث چند مہینوں کے بعد اخبار بند کرنا پڑا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں اپنے کنبے والوں کو ساتھ لے کر لکھنؤ چلے گئے۔ وہاں ان کا فرزند سورج پرکاش بی، اے۔ یوپی گورنمنٹ کے محکمہ اطلاعات میں ملازم ہو گیا۔ ایک سال کے بعد کانپور میں ایک نکاسی پریس انہیں الاٹ ہو گیا اور انہوں نے روزانہ "امرت" وہاں سے جاری کیا۔ اگست ۱۹۵۳ء میں کانپور سے دہلی آ گئے اور "ویربھارت" سے متعلق ہو گئے۔ ۱۹۵۴ء کی بیساکھی کے موقعہ پر پنجاب چلے آئے۔ پہلے انبالہ اور پھر امرتسر میں چند مہینے گزارنے کے بعد آخر جالندھر میں سکونت پذیر ہو گئے۔

اصول پرستی!

"بندے ماترم" کا ایڈیٹر بننے کے بعد ضمیر کی پیروی اور اصول کی پابندی انہوں نے جس سختی سے کی اس کی مثال اردو اخبار نویسی کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملے گی۔ وفا صاحب نے جس بات کو ملکی و قومی مفاد کے منافی سمجھا اس کی حمایت کرنا کبھی اور کسی بھی صورت میں منظور نہ کیا۔ ایسا ضمیر پرست اور اصول پرور اخبار نویس قدرتی طور پر بے خوف بھی ہوتا ہے اور اپنے خیالات کا اظہار کرنے میں نہ تو نتائج کی پرواہ کرتا ہے اور نہ ذاتی مصلحتوں کو بیچ میں آنے دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُن کی مالی قربانی جو انہوں نے کسی غیر کانگرسی اخبار کا رخ کرنے کی بجائے بار بار کئی سال کی مسلسل بے روزگاری کا سامنا کرنے کی شکل میں دی اس قربانی سے بھی زیادہ

قابلِ تحسین ہے جو انہوں نے خوشی خوشی قید فرنگ کے مصائب جھیلنے کی صورت میں کی۔ اخبار نویسوں میں ایسی ہستیاں بہت کم ہیں جن کو اس لحاظ سے وفا صاحب کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

شادی اور اولاد!

۱۹۰۷ء کے آغاز میں جبکہ ان کی عمر بارہ سال تھی ان کی شادی موضع رعیہ ضلع سیالکوٹ کے ایک متمول براہمن گھرانے میں پنڈت لبش داس کی لڑکی کیسرا دیوی سے ہوگئی۔ وہ ایک سادہ لوح۔ نیک طینت خوش اطوار سلیقہ شعار خاتون تھی۔ ادران میں ہندوستانی پتی برتا استری کے تمام اوصاف پائے جاتے تھے۔ وہ اپنے شوہر کو راحت و آرام پہنچانے کی خاطر ہر قربانی کرنے کے لئے تیار رہتی۔ وہ ذرا پرانے خیالات کی حامی تھی۔ اور چھوت چھات میں وشواش رکھتی تھی۔ مولانا تاجور کا وفا صاحب کے ہاں اکثر آنا جانا ہوتا تھا۔ مولانا کے چلے جانے کے بعد وہ گھر کی صفائی دوبارہ کرتی اور برتنوں کو خوب مانجھ رگڑ کر پوتر بناتی۔ وفا صاحب جیل میں تھے تو انہوں نے بھوک ہڑتال کر دی۔ پتنی چلنے پر بیوی ملاقات کے لئے گئی۔ وفا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے بھوک ہڑتال کیوں کی۔ وفا صاحب نے مذاقیہ طور پر جواب دیا کہ ہم براہمن ہیں لیکن جیل میں ہمیں شودروں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پڑتا ہے۔ ہم اپنا دھرم کس طرح بھرشٹ کریں۔ شریمتی جی نے فوراً کہا کہ آپ روٹی ہرگز نہ چھوڑیں خواہ آپ کو بھنگی کے ساتھ بیٹھ کر ہی کیوں نہ کھانا پڑے۔ اس طرح دھرم بھرشٹ نہیں ہوتا۔ وفا صاحب نے بہت اچھا کہہ کر دل میں کہا کہ میں بھی تو آپ سے یہی کہلوانا چاہتا تھا۔

۲۰ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اس لڑکے کا نام

سورج پرکاش رکھا گیا۔ لیکن وفا صاحب محبت اور پیار سے اُسے "بادا" کہا کرتے۔ بڑا ہونے پر بھی باپ اپنے لاڈلے بیٹے کو اسی نام سے پکارتا رہا۔ بی اے تک اُس کو تعلیم دلوائی۔ دھوم دھام سے شادی رچائی۔ بٹوارے سے پہلے سورج پرکاش باپ کے علمی ادبی اور اخباری کاروبار میں باپ کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ بٹوارے کے بعد یو پی گورنمنٹ کے محکمہ اطلاعات میں ملازمت اختیار کر لی۔ سورج پرکاش شعر و شاعری کا اچھا مذاق رکھتا تھا اور نقاد تخلص کرتا تھا۔ مگر بٹوارے کے تغیر و تبدل سے اس قدر متاثر ہوا کہ شعر کہنا بند کر دیا اور طبیعت کا میلان گیان دھیان کی طرف ہو گیا۔ ایک لڑکے کے سوا وفا صاحب کے ہاں اور کوئی اولاد نہ ہوئی۔

بیوی کی موت!

وفا صاحب کی رفیقۂ حیات ۱۹۰۷ء سے قریباً ساٹھ برس تک زندگی کے سفر میں ان کے ہمراہ رہیں اور پھر تھوڑا عرصہ بیمار رہنے کے بعد اگست ۱۹۶۶ء میں ان کو ہمیشہ کے لئے داغِ مفارقت دے گئیں۔ وفا صاحب فطرۃً اپنے کھانے پینے اور پہننے کے بارے میں "بے پرواہ" واقع ہوئے تھے اور بیوی ضرورت کے مطابق انہیں ہر چیز وقت پر مہیا کرتی تھی اس لئے وفا صاحب کو بیوی کی موت بے حد شاق گزری۔

بیٹے کی موت!

یہ کتنا بڑا اندوہناک سانحہ ہے کہ بیوی کی وفات کے پورے دس سال بعد وفا صاحب کا اکلوتا بیٹا سورج پرکاش لکھنؤ میں ۷ فروری ۱۹۷۶ء کو ایک شنٹنگ ریلوے انجن سے ٹکرا کر بہت بری طرح زخمی ہو گیا۔ بے ہوشی کے عالم میں اسے ہسپتال پہنچایا گیا۔ ڈاکٹروں کی انتہائی کوشش کے باوجود

اگلے دن یعنی ۸ رفروری ۱۹۷۶ء کو جان بحق ہوگیا۔ وفا صاحب کے لئے بڑھاپے میں اکلوتے جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ناقابل برداشت تھا۔ بیوی کی موت ہی سے اُن کی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا۔ بیٹے کی موت نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ نتیجہ کے طور پر ان کی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی۔ کمر خمیدہ ہوگئی۔ بڑھاپے کا آخری سہارا جاتا رہا۔ اب وفا صاحب کی حالت یہ تھی کہ نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں'۔ ان کے کرب، واضطراب کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے وہ دل خراش۔ جگر گداز اور جاں سوز مرثیہ پڑھا جائے جو انہوں نے جوان بیٹے کی موت پر کہا۔ وفا صاحب کے دو پوتے اور دو پوتیاں ہیں۔ پرماتما انہیں خوش وخرم رکھے۔ مگر بیوی اور بیٹے کی موت نے وفا صاحب کی دنیا تاریک کردی۔

شاعری کی ابتدا!

ویسے تو پرائمری سکول ہی میں وفا صاحب کو شعر وشاعری میں کافی شُد بُد ہوگئی تھی مگر شعر گوئی کا شوق انہیں ۱۹۱۱ء میں ہوا جب یہ آٹھویں جماعت کے طالب علم تھے۔ طبع خدا داد کی بدولت تھوڑے ہی عرصہ میں خوب کہنے لگے۔ اُس وقت ان کا مطالعہ سخن درسی کتب تک محدود تھا۔ اس لئے شروع شروع میں ذوق کا رنگ اختیار کیا۔ مثلاً ؎

ہوں گی پسِ فنا بھی یہ صحرا نوردیاں — بن جائے گا بگولہ ہمارے مزار کا

جو صورتِ جادہ کبھی اُف تک نہیں کرتے — ہوتے ہیں وہ پامالِ ستم اور زیادہ

بھلا جس بزم میں غیروں کی کھچڑی پکتی رہتی ہو

وہاں کب اے دلِ نادان ہماری دال گلتی ہے

رہا بعد مُردن بھی دیوانہ پن — مری رُوح بھی سوئے صحرا گئی

پھر داغ کی سادگی۔ برجستگی اور شوخی پسند آئی اور یوں کہنے لگے ؎

عبث روز جزا تم جھینپتے ہو داد خواہوں سے — مری جاں اب نگاہیں کیوں نہیں ملتیں نگاہوں سے

کون ہے جو رات ساری بیٹھ کر سنتا رہے — اے وفاؔ تیرا تو قصہ مختصر ہوتا نہیں

تمہیں اس کوچے میں دیکھا ہے راتوں کو وفاؔ اکثر — زمانہ جانتا ہے خوب جیسے پارسا تم ہو

اس رنگ میں رفتہ رفتہ مومنؔ کے تغزل اور میرؔ کے سوز و گداز کی آمیزش ہوتی گئی اور انداز کلام یہ ہو گیا ؎

آدمی کام آ ہی جاتا ہے — ہم سے کیجے نہ اجتناب بہت

حشر میں وہ کہہ رہے ہیں قتل کر دوں گا اگر — واں لب فریاد میرے داد خواہوں نے کیا

داد کے قابل تھا میرا ضبطِ الفت بزم میں — راز افشا تیری شرمیلی نگاہوں نے کیا

میں ہٹ گیا تو گردش دوراں بھی تھم گئی — میرے ہی واسطے ستم روزگار تھا

اُمید وفا! وفاؔ بتوں سے — اے مردِ خدا! خدا خدا کر

یہ تمام مرحلے زمانۂ طالب علمی ہی میں طے ہو گئے۔ داغؔ، مومنؔ اور میرؔ کے امتزاج سے جو رنگ پیدا ہوا وہ آگے چل کر اُن کے دلی جذبات و محسوسات، مجلسی رجحانات اور روزمرہ کے واقعات سے متاثر ہو کر بجائے خود ایک نیا رنگ بن گیا اور آج اُن کا اپنا رنگ مانا اور پہچانا جاتا ہے۔

تلمذ!

وفاؔ صاحب ذہین اور خوش مشق تو تھے ہی۔ ایک ہی سال میں انہیں احساس ہو گیا کہ ان کے اشعار بغرض اصلاح کسی کامل استاد کے سامنے رکھے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے پنڈت راج نارائن ارمانؔ دہلوی سے جو مرزا داغؔ کے ارشد تلامذہ کی صفِ اوّل میں شمار ہوتے تھے اور بسلسلہ اخبار نویسی لاہور میں قیام رکھتے تھے، بذریعہ خط و کتابت رشتۂ تلمذ قائم کیا۔ فاضل استاد نے چار پانچ بار کلام دیکھنے کے بعد لکھدیا کہ طبیعت بہت

موزوں ہے۔ اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں۔ خود ہی نظر ثانی کر لیا کرو۔ اس کے باوجود یہ اپنا کلام ان کو بھیجتے رہے۔ ان کی کئی نظمیں ان کے اخبار میں کسی لفظ کی تبدیلی کے بغیر شائع ہوئیں۔ سنہ ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کر کے لاہور چلے گئے اور بلا ناغہ حاضر خدمت ہو کر مشورہ سخن کرنے لگے۔

حافظہ اور مطالعہ

وفا صاحب کو قدرت کی طرف سے غضب کا حافظہ ودیعت ہوا تھا۔ اپنا سارا کلام انہیں ازبر تھا۔ اس کے علاوہ دوسرے اردو فارسی کے استادوں کے بے شمار شعر یاد تھے۔ کسی ادبی بحث کے دوران میں جب سند کے طور پر کسی حوالے کی ضرورت پڑتی تو یہ فوراً موقع و محل کے مطابق اپنی یادداشت سے کسی استاد کے شعر کا حوالہ دے دیتے اور معترض کی زبان ساکت ہو جاتی۔ ان کے حافظے کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ بھی ہے کہ اپنی ہر غزل کے شعر اسی ترتیب میں زبانی دُہرا سکتے تھے جس ترتیب میں وہ اشعار چھپے ہوتے۔ پچھلے دنوں جب میں انہیں ملنے جالندھر گیا تو رات کو سوتے وقت کہنے لگے کہ نیند بہت کم آتی ہے۔ اکثر جاگتا رہتا ہوں۔ رات کو اس بیداری کی حالت میں لیٹا لیٹا اپنے سارے کلام کا ایک دوبار "پاٹھ" کر لیتا ہوں۔

مطالعہ کتب کے بارے میں وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں نے بہت تھوڑی کتابیں پڑھی ہیں لیکن اخذ و استفادہ بہت زیادہ کیا ہے۔ مطالعہ کی کمی کو میں نے زندگی بھر اپنی اخذ کرنے کی صلاحیت سے پورا کیا ہے۔ مجھے ان سے تینتیس سال سے بہت قریب کا واسطہ رہا اور میں نے دیکھا کہ ان کے پاس کوئی باقاعدہ لائبریری نہیں۔ معدودے چند کتابیں جو الماری میں پڑی تھیں وہ ایسا لگتا کہ ان کو دیر سے کسی نے پڑھا نہیں۔ پڑھنا تو درکنار ان کتابوں

پر سے گرد جھاڑنے کے لئے انہیں اِدھر اُدھر ہٹانے کی تھی کبھی کوشش نہیں کی گئی۔ میں نے جو کتابیں ان کی الماری میں پائیں ان کی فہرست کچھ اس طرح ہو سکتی ہے۔ دیوان آتش۔ دیوان ذوق۔ دیوان غالب۔ دیوان مومن کلام داغ۔ دیوان حالی۔ مقدمہ دیوان حالی۔ یادگار غالب۔ آب حیات۔ گلستاں و بوستاں۔ ان کتابوں کے علاوہ بہت سے ایسے شعری مجموعے تھے جو آج کل کے شعرا حضرات انہیں ہدیۃً بھیج دیتے۔

کہنے لگے کہ یہ کتابیں اب میرے کسی کام کی نہیں۔ آپ لے جائیں۔ میں نے عرض کیا کہ سوائے "آب حیات" کے باقی یہ تمام کتابیں میرے پاس موجود ہیں" سو میں آب حیات لے لیتا ہوں۔

میرے پاس آتے تو نظم و نثر کی مختلف کتابیں مجھ سے پڑھوا کر سنا کرتے اور اس دوران میں کئی ادبی۔ فنی نکتے بھی بیان کرتے۔

مولانا تاجور سے ملاقات!

علامہ تاجور مرحوم سے اُن کی شناسائی ۱۹۱۵-۱۶ء کے موسم سرما کے ایک بازاری مشاعرہ کے موقعہ پر ہوئی۔ ان دنوں کبھی کسی چوک میں اور کبھی بازار انار کلی کے کسی فراخ حصّے میں سر شام ایک میز کرسی لگ جاتی تھی اور کوئی صاحب کرسی پر بٹھا دیئے جاتے تھے۔ یہ اہتمام دیکھ کر آتے جاتے لوگ جن کے پاس فرصت کا کچھ وقت ہوتا تھا میز کے ارد گرد کھڑے ہو جاتے تھے۔ اس طرح جب حاضرین کی تعداد بیس پچیس تک پہنچ جاتی تھی تو اسٹیج سے اعلان ہوتا تھا کہ اب مشاعرہ شروع ہوتا ہے۔ جس مشاعرے کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس میں سٹیج سیکرٹری کے فرائض علامہ تاجور مرحوم سرانجام دے رہے تھے۔ مصرعہ طرح تھا ع

"دل کا نقصان بھی ہے جان کا نقصان بھی ہے"

وفا صاحب بھی سامعین میں کھڑے تھے۔ چند غزلیں پڑھی جانے کے بعد وفا صاحب نے کاغذ کے پرزے پر پنسل سے ایک شعر لکھ کر علامہ تاجور کو پہنچوایا کہ اُن کے نام سے پڑھ دیا جائے۔ مولانا تاجور یہ شعر دیکھ کر پھڑک اُٹھے اور اسے پڑھ کر سناتے ہوئے انہوں نے بدیں الفاظ خراج تحسین ادا کیا کہ وفا صاحب نے ایک ہی شعر کہا ہے مگر یہ ایک شعر اس مشاعرے کی ساری غزلوں پر بھاری ہے اور صحیح معنوں میں حاصلِ مشاعرہ ہے۔ کم از کم اب میں تو اپنی غزل نہیں پڑھوں گا۔ شعر یہ تھا ۔

جان پر کھیلنا مشکل ہے مگر یاد رہے
کھیلنے پر کوئی آجائے تو آسان بھی ہے

حاضرین نے بڑی داد دی۔ مشاعرے کے بعد علامہ اُن سے باتیں کرتے ہوئے اُن کے مکان تک ہمراہ گئے۔ اگلے دن سے کبھی یہ اُن کے مکان پر جانے اور کبھی وہ اِن کے مکان پر آنے شروع ہو گئے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں یہ ملاقاتیں قریبی رفاقت میں بدل گئیں۔

اور ۱۹۱۶ء میں ان کے اشتراک سے شیخ عبدالقادر کی زیر سرپرستی مشہور ادبی جماعت "انجمن ارباب علم" قایم ہوئی۔ اس انجمن کے زیر اہتمام ایس پی۔ ایس کے ہال میں شاندار طرحی اور غیر طرحی مشاعرے ہوتے تھے۔ ان مشاعروں کا سلسلہ بٹوارے سے ایک سال پہلے تک بڑے زور شور سے جاری رہا اور ان کی بدولت نہ صرف لاہور میں بلکہ پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی عالم گیر ادبی سرگرمی کی لہر پھیل گئی اور شعر و شاعری کا چرچا عام ہو گیا۔

معاصرین! شریکِ مشاعرہ ہونے والوں میں آغا حشر کاشمیری ۔

پنڈت راج نارائن ارمان دہلوی۔ خواجہ دل محمد دل۔ آغا بیدار بخت بیدار۔ سردار اودے سنگھ شایق۔ منوہر سہائے انور۔ منشی محمد دین فوق۔ حکیم احمد شجاع پرنسپل طپش۔ مولانا سہا۔ مولانا اکبر شاہ آکبر نجیب آبادی۔ نازش لاہوری۔ مولانا شاداں بلگرامی اور ڈاکٹر عندلیب شادانی کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا ظفر علی خاں۔ حفیظ جالندھری۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر۔ پنڈت ہری چند اختر۔ یاس یگانہ لکھنوی۔ اصغر گونڈوی۔ جگر مرادآبادی۔ منشی تلوک چند محروم۔ مولانا چراغ حسن حسرت۔ سردار جعفری۔ احمق پھپھوندوی۔ فہیم گوالیاری مولانا عبدالمجید سالک بٹالوی۔ آرزو لکھنوی۔ نازش بدایونی۔ صوفی غلام مصطفےٰ تبسم۔ جلال الدین اکبر۔ حفیظ ہوشیارپوری نے بھی شرکت کی۔ اختر شیرانی۔ عابد علی عابد۔ فاخر ہریانوی۔ روش صدیقی۔ احسان دانش۔ عبدالمجید عدم۔ نظر سوہانوی بھی اسی انجمن کے دروازے سے مولانا تاجور کے حلقہ تلمذ میں داخل ہوئے اور دنیائے شاعری میں شہرت یاب ہوئے۔

اتحاد ثلاثہ: اوفا صاحب کے پاس سردار اودے سنگھ شایق کا آنا جانا زمانہ کالج ہی سے تھا۔ اسی آنے جانے میں شایق صاحب مولانا تاجور سے بھی متعارف ہوئے اور انجمن ارباب علم کے انتظامی اور تنظیمی امور میں عملی دلچسپی لینے لگے۔ اس طرح پنجاب کی ادبی دنیا کی سٹیج پر ہندو۔ مسلم۔ سکھ اتحاد ثلاثہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے بعد لاہور کی مشہور و معروف فرم عطر چند کپور اینڈ سنز نے شیخ نور الٰہی انسپکٹر اوف سکولز لاہور ڈویژن کی سرپرستی میں ایک ادارہ "اردو مرکز" کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد قدیم و جدید اردو نظم و نثر کا انتخاب سلسلہ وار کتب کی شکل میں ترتیب دینا تھا۔ مولانا تاجور کو اس کا چیف ایڈیٹر مقرر کیا گیا۔ مولانائے موصوف نے بہت جلد اپنے پرانے رفقائے کار وفا صاحب

اور شائق صاحب کو معاون خصوصی کے طور پر اُردو مرکز میں لے لیا۔ ان کے علاوہ ملک بھر کے بہت سے نامور ادیبوں اور مقتدر شاعروں کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔ گویا یہاں بھی اتحاد ثلاثہ کو اُردو ادب کی دوش بدوش خدمت کرتے ہوئے دیکھا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا۔ ایک دو سال کے قلیل عرصہ میں نظم و نثر کی بیسیوں کتابیں منظرِ عام پر آگئیں۔

شعر خوانی!

کہنے کی طرح شعر کہنا تو وفا صاحب کو ابتدا ہی سے آگیا مگر پڑھنے کی طرح پڑھنا تمام عمر میں بھی نہ آیا آج سے کوئی چالیس سال پہلے تو حالت یہ تھی کہ جب یہ مشاعرے میں کلام پڑھتے تھے تو بقول علامہ تاجور لفظوں کا قیمہ کرتے تھے۔ بسا اوقات شبہ ہوتا تھا کہ مصرعے کے مصرعے وزن سے گر رہے ہیں۔ سامعین احترام کے ساتھ ان کا کلام سنتے اور داد دیتے تھے تو اس لئے کہ شعرا کے ہر حلقہ میں انہیں وقار کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے متعلق یہ فقرہ زبان زدِ خاص و عام تھا کہ کبھی صحیح نہیں بولتے مگر کبھی غلط نہیں لکھتے۔

لکنت!

وفا صاحب کی زبان میں بچپن ہی سے لکنت تھی۔ ایک طبیعت سادہ دوسرے لباس سادہ۔ تیسرے لکنت۔ ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے پھر کون عقلمند انہیں اتنا بڑا شاعر سمجھتا۔ ایک دن منشی محمد دین فوق جو زمیندار اخبار میں کام کرتے تھے کہنے لگے کہ وفا صاحب اگر آپ کی زبان میں لکنت نہ ہوتی تو آپ بلاشبہ ہر مشاعرہ لوٹ لیا کرتے۔ وفا صاحب نے فی البدیہہ یہ شعر کہا ؎

اے وفاؔ مانعِ اظہار نہیں کچھ لکنت
کہ مرے منہ سے نکل جاتی ہے فرفر فریاد

فوقؔ صاحب بے حد خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ خدا تعالیٰ نے آپ کو شعر وسخن کی ایک بے بہا نعمت عطا فرمائی ہے۔ لکنت سچ مچ آپ کے راستہ میں کوئی رکاوٹ نہیں۔

سادگی!

شہرۂ آفاق افسانہ نگار مہاشہ سدرشن نے اپنی تالیف کردہ کتاب گلدستہ سخن میں وفاؔ صاحب کے متعلق لکھا ہے کہ دیکھنے میں گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ شخص شعر کہنا تو درکنار شعر سمجھ بھی سکتا ہوگا۔ اور مسٹر ریاض قریشی مولف بہارستان کے الفاظ میں ان کی نظر خراش صورت اور لاابالیانہ ہیئت کذائی مدت تک ان کی ادبی طاقتوں کا حجاب اکبر بنی رہی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا۔ کہ جب یہ کسی سے اُردو میں بات چیت کرتے تو مسلسل چار فقرے بھی صحیح نہ بول سکتے۔ اس سے ایک ناواقفِ حال کو ان کے اَن پڑھ ہونے کا گمان گزرنا کوئی غیر قدرتی نہ تھا۔

لطیفہ!

۱۹۳۰ء میں بجرم بغاوت وفاؔ صاحب گجرات جیل میں دو سال کی قید کاٹ رہے تھے۔ سیاسی قیدیوں کو صرف اخبار سول ملٹری گزٹ مہیا کیا جاتا تھا۔ ایک دن جب یہ اخبار کا مطالعہ کر رہے تھے تو دہلی کے ایک سیاسی قیدی نے ان سے کہا مجھے دس پندرہ منٹ کے لئے خبریں دیکھ لینے دیجئے۔ پھر آپ سارا دن مورتیں دیکھتے رہنا۔ ڈاکٹر ستیہ پال بھی وہاں موجود تھے۔ وہ یہ الفاظ سن کر بے تحاشا زور زور سے ہنسنے لگے اور دیر تک

ہنستے رہے۔ دہلوی قیدی نے اس غیر معمولی ہنسی کا سبب پوچھا تو انہوں نے کہا کہ جس شخص پر آپ نے موتیں دیکھنے کا فقرہ چست کیا ہے۔ اُس سے میں اور آپ دونوں کم از کم ایک سال تک اخبار بینی کا سبق لے سکتے ہیں۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے بتانے پر بھی اُسے یقین نہ آیا کہ یہ شخص پنجاب کے سب سے بڑے قوم پرست اور کثیر الاشاعت اخبار "ویر بھارت" کا آتش رقم ایڈیٹر پنڈت میلا رام وفاؔ ہے۔

لطیفہ!

ایک دن پروفیسر پرشوتم لال ضیاؔ جو کہ ایک فلم کمپنی کے لئے کسی خوش گلو ایکٹرس کے متلاشی تھے انہیں جی بی روڈ کی ایک نظر افروز مغنیہ کے بالاخانے پر لے گئے۔ ان کی فرمائش پر اس نے ایک غزل گائی۔ غزل کے اشعار بالکل معمولی تھے۔ ضیاؔ صاحب تو حسنِ ترنم پر سر دھنتے رہے مگر وفاؔ صاحب ذرا بھی لطف اندوز نہ ہوئے۔ گانا ختم ہوا تو ضیاؔ صاحب نے پانچ روپے کا ایک نوٹ مغنیہ کو دیا۔ مغنیہ نے وفاؔ صاحب کو صمٌ بکمٌ بیٹھے دیکھا تو ضیاؔ صاحب سے کہا کہ اگر یہ بزرگ اردو نہیں سمجھ سکتے تو پنجابی کی کوئی چیز سنا دوں۔ ضیاؔ صاحب کھل کھلا کر ہنس پڑے اور بے ساختہ کہہ اٹھے پنڈت جی ہم گھاٹے میں نہیں رہے پانچ روپے کا نوٹ دے کر پچاس روپیہ کا لطیفہ لے چلے ہیں۔

لطیفہ!

مولانا حسرت موہانی لاہور تشریف لائے تو مولانا ظفر علی خاں ایڈیٹر زمیندار کے ہاں ٹھہرے۔ مولانا نے وفاؔ صاحب سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ انہیں بتایا گیا کہ وفاؔ صاحب ویر بھارت کے ایڈیٹر ہیں اور اخبار کا دفتر فلاں سڑک پر واقع ہے۔ مولانا حسرت نے دفتر ویر بھارت میں پہنچ کر وفاؔ صاحب

کے متعلق دریافت کیا۔ کمرے کے دروازے پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے اشارے سے بتایا کہ پنڈت جی اندر کام کر رہے ہیں۔ مولانا کمرے میں داخل ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میز اور کرسی تو خالی پڑے ہیں مگر ایک سادہ لباس آدمی نیچے چٹائی پر بیٹھے کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ اردگرد کاغذ بکھرے پڑے ہیں اور حقے کی نے اس کے منہ سے لگی ہوئی ہے۔ مولانا کچھ دیر دروازے میں کھڑے رہے لیکن وفا صاحب نے اپنی محویت میں انہیں نہ دیکھا۔ پھر جب ذرا آنکھ اُٹھائی تو سامنے کھڑے آدمی سے بے اعتنائی کے عالم میں کہا "یہہ جا بھلیا لوکا" (بھلے آدمی تشریف رکھئے) مولانا یہ ٹھیٹھ پنجابی نہ سمجھ سکے۔ انہیں یقین نہ آیا کہ یہ وفا صاحب ایڈیٹر ویربھارت ہوں گے۔ واپس لوٹ گئے مولانا ظفر علی خاں سے سارا ماجرا کہہ سنایا تو مولانا ظفر علی خاں نے ہنس کر کہا ارے وہی تو پنڈت میلا رام وفا تھے

لطیفہ ۱۹۲۱ء میں وفا صاحب مولانا تاجور کی شادی پر رام پور گئے۔ وہاں منشی واجد علی اکبر قدوائی نواب رام پور کے پرائیوٹ سیکرٹری تھے ان کے بڑے بھائی منشی علی احمد شوق قدوائی بھی انہی کے ساتھ سرکاری بنگلے میں قیام رکھتے تھے وفا صاحب کی معیت میں اُن سے ملے۔ صحبتِ شعر و سخن گرم ہوئی انہوں نے کلام سنایا۔ وہ ہر شعر پر معذرت آمیز تعجب سے وفا صاحب کا منہ تکتے تھے اور علامہ تاجور شعر کو دہرا کر اُن کی مشکل حل کرتے تھے۔ اِس پر شوق صاحب داد تو دیتے تھے لیکن ان کے چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی روایتی وضعداری پر ناقابلِ برداشت بوجھ پڑ رہا ہے۔ وہ دل میں سمجھتے تھے کہ علامہ بغرض تفریح لاہور سے ایک نیم خواندہ پنجابی دوست کو ساتھ لے آئے ہیں اور اپنے شاعرانہ وقار کے پیشِ نظر پنڈت میلا رام وفا ظاہر کر رہے ہیں صحبت کے خاتمے پر شاید معاملے کی تہہ کو پہنچنے کے لئے انہوں نے علامہ

سے کہا کہ آج ایک مصرع ہوا ہے۔ ع

"آگ ادھر تو دل میں ہے اور ادھر جگر میں ہے"

اس پر کل کی صحبت کے لئے ہم تینوں غزلیں کہیں۔ اگلے دن وفا صاحب تو چھ سات شعر کی مختصر سی غزل کہہ کر لے گئے مگر نہ علامہ تاجور نے کوئی شعر کہا اور نہ شوق صاحب نے۔ علامہ کو تو بھلا شادی کی مصروفیت تھی۔ لیکن شوق صاحب کے متعلق اس کے سوا اور کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ انہیں وفا صاحب کا امتحان لینا مقصود تھا۔ خیر شوق صاحب غزل سن کر بہت محظوظ ہوئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ یہ شخص جو علامہ کے ساتھ آیا ہے کوئی ایرا غیرا نیم خواندہ پنجابی نہیں بلکہ واقعی اردو کا سحر طراز سخن سرا پنڈت میلا رام وفا ہے۔

عادات!

وفا صاحب کی عادتیں نہایت سادہ اور دیہاتی ماحول کے مطابق تھیں۔ یہ کھانے پینے اور پہننے میں کسی قسم کا تکلف نہیں کرتے تھے۔ پھر بھی کسی عادت کے غلام نہیں تھے۔ ہاں چائے ان کی ایک بہت بڑی کمزوری تھی۔ چائے جتنی بار مل جائے انکار نہیں کرتے تھے۔ چائے بہت گرم اور بہت جلد پی جاتے تھے۔ چائے میں چینی بہت زیادہ ڈال کر پیتے تھے۔ پچھلے پانچ سات سالوں سے ان کی خوراک بہت کم ہو گئی تھی جو تھوڑی کھانا کھاتے اس کے کھانے میں وقت بہت لگتا کیونکہ ان کے منہ میں دانت نہ تھے مصنوعی دانت لگوانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھتے تھے۔ کالے چنوں کا شوربہ ان کا من بھاتا کھاجا تھا۔ اس کے علاوہ ساگ کی طرح گھوٹ کر پکائے ہوئے شلجم بھی بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ سالن میں نمک

اتنا زیادہ ڈال کر کھاتے تھے جتنا شاید کوئی اور کھانا پسند نہ کرے۔ رات کی روٹی نہیں کھاتے تھے بلکہ دودھ پی کر سو جاتے۔ غذائیت کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اکثر کسی نہ کسی ٹانک کا استعمال کرتے رہتے۔

لباس اور جوتے کے بارے میں بے حد لاپرواہ واقع ہوئے تھے۔ کپڑے صاف ہوں یا میلے کچیلے۔ جوتا پالش کے بغیر ہو یا پھٹا ہوا۔ اسی حالت میں بازار میں نکل پڑتے تھے۔ اور چونکہ جسمانی کمزوری کے سبب زیادہ چل نہیں سکتے تھے اس لئے جہاں بھی چاہے سر بازار بیٹھ جاتے۔

جب یہ فکر سخن کرتے تو اتنے محو ہو جاتے کہ انہیں خبر تک نہ ہوتی کہ ان کے کمرے میں کون آیا کون گیا کوئی کیا چھوڑ گیا کیا لے گیا۔ اسی عالم میں بیڑی بجھ جاتی تو پھر سلگاتے۔ وہ پھر بجھ جاتی۔ اس طرح بار بار سلگانے سے دیا سلائی کی تیلیاں ایک ہی بیڑی پر ختم کر چھوڑتے۔ اگر کوئی شعر ہو جاتا تو کاغذ پر قلم بند نہ کرتے۔ حافظے ہی میں محفوظ رکھتے۔ میں جاتا تو اس عرصہ میں کہا ہوا سارا کلام وہ مجھے زبانی سنا دیتے اور میں اُن کی بیاض میں درج کر دیتا اور اس کی ایک نقل اپنے ساتھ لے آتا کیونکہ ان سے یہ بھی کوئی بعید نہ تھا کہ وہ بیاض ہی کہیں گم کر بیٹھیں۔

سوتے وقت سرہانہ نہیں لیتے تھے۔ کہتے کہ اس سے گردن اکڑ جاتی ہے۔ ضعفِ بصارت کی وجہ سے گزشتہ سال دو سال سے شاذ و نادر ہی لکھتے پڑھتے تھے۔ اگر لکھتے تو اکثر لفظوں پر لفظ چڑھ جاتے۔

پہلے جب بینائی درست تھی تو نثر لکھتے وقت بہت زیادہ کانٹ چھانٹ کرتے۔ قلم زد الفاظ پر لکیریں کھینچ کر کبھی دائیں حاشیہ میں کبھی بائیں حاشیے میں۔ کبھی اوپر کبھی نیچے لکھنے جاتے۔ اس طرح صفحے کے آخیر

تک پہنچتے پہنچتے آپ کی تحریر ایک عجیب وغریب نقشہ بن کر رہ جاتی۔ میں نے جب کبھی حیرانی سے پوچھا کہ آپ کی تحریر کو آپ کے کاتب کے لئے ٹھیک پڑھنا بے حد مشکل ہوتا ہوگا تو فرماتے کہ میرے کاتب کو میری نوشت پڑھنے میں کبھی غلطی نہیں لگی۔ میں اس ڈھنگ سے نشان دہی کرتا جاتا ہوں کہ کاتب میری لکیروں کا پیچھا کر کے صحیح الفاظ پر پہنچ جاتا ہے۔

حقہ نوشی!

وفا صاحب کو حقہ نوشی کی عادت بچپن ہی سے تھی۔ اور یہ بزرگوں کی دین تھی۔ ان دنوں حقہ پینا ایک امیری ٹھاٹھ میں شامل تھا۔ وفا صاحب جب چلم بھر کر اپنے کسی بزرگ کے سامنے حقہ رکھ دیتے تو پہلے پانسات کش جن کا کھینچنا مشکل ہوتا وفا صاحب کو کھینچنے کے لئے کہا جاتا اور وفا صاحب یہ خدمت بصد شوق سرانجام دیتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ حقہ نوشی کی عادت پختہ ہوگئی۔ یہاں تک کہ جوانی میں حقہ ان کا مونس وغمخوار اور رفیق تنہائی بن گیا۔ جب انہوں نے اخبارات میں کام کرنا شروع کیا تو ایک حقہ دفتر میں رکھنا لوازمات میں سے خیال کیا گیا۔ میں نے اکثر دیکھا کہ وہ حقہ بھرنے ہی کے گنہگار ہوتے۔ حقہ کی نے منہ میں داب کر آپ عالم تخیل میں پرواز کر جاتے۔ حقہ بیچارا بجھ جاتا۔ پھر جب آسمانوں سے زمین پر اترتے تو حقہ کا کش لگاتے۔ پھر پے در پے دوچار کش اور زور سے بھرتے۔ مگر حقہ اس وقت تک بے جان ہوگیا ہوتا۔

اسی ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ چلم بھر کر دفتر میں اطمینان سے بیٹھ گئے۔ کچھ کوئلے جو ابھی جاندار تھے وہاں چولھے میں چھوڑ آئے کہ دوسری چلم بھرنے میں کام آئیں گے۔ پہلی چلم ختم ہوگئی تو دوسری کے

لئے بڑی بیتابی سے چولھے کی طرف بڑھے۔ اُن کی مایوسی کی کوئی حد نہ رہی جب دیکھا کہ کوئلے مر چکے تھے۔ اس عالم بے چارگی میں اور تو کچھ بن نہ پڑا ہمارے حقہ نوش شاعر نے کوئلے کا مرثیہ لکھ مارا ؎

اوجھل ہوا آنکھوں سے چمکتا ہوا تارا — اور ڈوب گیا ساتھ ہی قسمت کا ستارا

وہ کوئلہ تو عالم فانی کو سدھارا — یاں آس مٹی ٹوٹ گیا جی کا سہارا

حقہ نوشی دراصل پرانے نوابوں۔ رئیسوں اور امیروں کا ایک شغلِ بیکاری تھا۔ حقّے کو موسم کے مطابق دو تین یار دن میں نہلانا دھلانا۔ پھر بڑی محنت سے تیار کیا ہوا تمباکو چلم میں بھرنا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کش لگا کر اُسے "چلانے" کی کوشش کرنا۔ اس سارے عمل کے لئے وقت اور فراغت کی ضرورت ہے۔ جوں جوں زندگی کی مصروفیات بڑھتی گئیں اور حقہ پینے میں مشکلیں پیش آنے لگیں تو وفا صاحب حقہ چھوڑ کر سگریٹ پر آگئے۔ جیب میں سگریٹ کی ڈبیہ اور ماچس ہو تو جہاں جی چاہے سیگریٹ سُلگا لیا۔ کوئی دیر نہیں لگتی۔ کوئی محنت نہیں کرنی پڑتی۔ یہ وثوق سے کہا نہیں جا سکتا کہ وفا صاحب سگریٹ سے بیڑی پر کب اور کن حالات کے ماتحت آئے۔ ہاں اتنا پتہ ہے کہ ایک دن بیڑی سلگانے کے لئے دیا سلائی جلائی تو آگ بیڑی کی بجائے مونچھوں میں جا لگی۔ اُس دن سے داڑھی کے ساتھ مونچھوں کا بھی صفایا کرنے کا فیصلہ ہو گیا۔ وفا صاحب نے کئی بار اپنے بستر کے کپڑے سگریٹ اور بیڑی سے جھلس دیئے۔ ایک بار تو سارے بستر ہی کو آگ لگ چلی تھی۔

ایک دن میرے ہاں بیٹھے حقہ نوش فرما رہے تھے۔ موڈ اچھا تھا۔ میں نے کہا پنڈت جی! حقّے پر ایک شعر سنیئے ؎

حقّے کا جو دشمن ہے وہ انسان کا دشمن — ہندو کا۔ مسیحی کا۔ مسلمان کا دشمن

بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے حقّہ بلاشبہ انسان دوستی کا علمبردار ہے۔

(ڈاکٹر منوہر سہائے انور (سہسوانی)

انور صاحب اُن کے بے تکلّف اور قریبی دوستوں میں سے تھے۔ اور مولانا تاجور کی طرح صبح و شام ان سے ملتے۔ محفلِ شعر و سخن گرم ہوتی اور کبھی کبھی شاعرانہ نوک جھونک بھی ہو جاتی۔ ایک دن انور صاحب نے کہا ؎

آ اے امامِ اُمّتِ شیطانِ شاعری | دوں تجھ کو درسِ مذہبِ یزدانِ شاعری

پہلے تو وفا صاحب خاموش رہے پھر کچھ سوچ کر بولے ؎

اک طفلِ بدتمیز یہاں سہسوان سے | داب بغل میں آیا ہے جزدانِ شاعری
آتا ہے رات دن اُسے شیطان کا خیال | گویا کہ ہے وہ نطفۂ شیطان شاعری

مناسب جواب پاکر انور صاحب کی تشفی ہوگئی۔

انور صاحب بھائی پرمانند کے اُردو اخبار "ہندو" میں کام کرتے تھے اور وہ اکثر بھائی صاحب کی مدح سرائی اور وفا صاحب کی حب الوطنی پہ پھبتیاں کستے۔ وفا صاحب نے ایک روز انور صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ؎

اے ناصیہ فرسائے درِ دولتِ حکّام | اربابِ نجابت کا چلن اور ہی کچھ ہے
"بھائی" کی ستائش نہیں حُبِ وطن اصلا | حُبِ وطن اے مشفقِ من اور ہی کچھ ہے
کچھ اور ہے قوالیِ عمّالِ حکومت | اور زمزمۂ حُبِ وطن اور ہی کچھ ہے

اِس کے باوجود انور صاحب وفا صاحب کے کمال شاعری کے معترف تھے کہتے ہیں ؎

انور بجز وفائے سخن ور جہان میں | اپنا کوئی حریف کمالِ سخن نہیں

مذہب! مذہبی عقائد کی رُو سے وفا صاحب سناتن دھرمی تھے۔ تاہم

وسیع انقلاب تھے۔ نظریاتی اختلافات کے باوجود یہ رشی دیانند کی عظمت کے معترف تھے۔ تنگ دلی اور مذہبی تعصب سے اُن کا دامن یکسر پاک تھا ہر مذہب اور ہر فرقے کا دل سے احترام کرتے تھے۔ خدا کے بعد وطن کو سب سے بڑا معبود سمجھتے تھے۔ ایسے وطن پرست انسان کم ہوتے ہیں جو حب الوطنی کو مذہب کا درجہ دیتے ہوں۔

گروہ بندی!

وہ سب لوگ جنہوں نے وفا صاحب کی شاعری کا باقاعدہ مطالعہ کیا ہے میرے اس خیال سے اتفاق کریں گے کہ وفا صاحب کے شاعرانہ مرتبے کا صحیح اعتراف ابھی نہیں ہوا۔ اہلِ نظر کا ایک محدود حلقہ ہے جو ان کی عظمت واہمیت کو محسوس کرتا ہے لیکن ناقدین کے بڑے گروہ نے ان کی شاعری پر وہ توجہ صرف نہیں کی جس کی وہ حقدار ہے۔ اس کی ایک وجہ تو وفا صاحب کی خوئے استغنا ہے۔ خود تشہیری کے فن سے نہ صرف یہ کہ وہ ناواقف تھے بلکہ اس سے نفرت بھی کرتے تھے۔ کسی قسم کی ادبی گروہ بندی میں وہ کبھی شامل نہ ہوئے سستی شہرت کو انہوں نے ہمیشہ اپنے مرتبے سے فروتر سمجھا لیکن ایک اور وجہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کم آمیز طبیعت کے مالک تھے۔ ان کو گھلنے میں دیر لگتی تھی۔

لاہور میں کئی ادبی گروہ موجود تھے جو ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اس طرف علامہ تاجور اور احسان دانش وغیرہ کا گروہ تھا تو دوسری جانب حفیظ جالندھری۔ ڈاکٹر تاثیر اور پنڈت ہری چند اختر وغیرہم جیسے افراد حقِ تنظیم ادا کر رہے تھے۔ مرحوم اختر شیرانی اور پنڈت میلا رام وفا کا تعلق اگرچہ علامہ تاجور کی جماعت سے تھا مگر وفا صاحب تو کنوں کے

اُس پھول کی طرح تھے جو کیچڑ میں پیدا ہوتا ہے مگر اس کی نجاستوں سے آلودہ نہیں ہونے پاتا۔ وفاصاحب کی مرنجان مرنج طبیعت۔ درویشانہ سیرت نے ان کو ہر حلقے میں محبوب و محترم بنائے رکھا۔

شاگرد!

وفاصاحب پیشہ ور شاعر نہیں تھے۔ بیکاری کے طویل وقفوں میں بھی انہوں نے شاعری کو اپنا ذریعہ معاش کبھی نہ بنایا۔ اسی لئے شاگردوں کی فوج بھرتی کرنے کی ہوس سے بھی مبرا تھے۔ ان سے فیضیاب ہونے والوں کی تعداد تو بہت ہے لیکن ان کے باضابطہ شاگردوں کی فہرست بڑی مختصر ہے۔

وفاصاحب بذریعہ ڈاک کبھی شاگرد کو اصلاح نہیں دیتے تھے۔ یا تو شاگرد خود ان کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غزل درست کروائے یا وفاصاحب شاگرد کے ہاں مقام رکھ لیں اور وہاں سامنے بیٹھ کر شاگرد اپنا کلام سناتا جائے اور اُستاد جہاں ضرورت ہو مناسب ردوبدل کر دے۔ عام طور پر وہ شاگرد کے ردیف و قافیہ اور نفسِ مضمون کو قائم رکھتے ہوئے شعر کو درست کر دیتے۔ کئی دفعہ اپنی طرف سے بھی شعر کہہ کر شاگرد کو دے دیتے۔ بعض حالتوں میں بے حد اُلجھے ہوئے اور ناقص مضمون والے شعر کو قلم زد کروا دیتے۔

وفاصاحب کی اعانت سے مندرجہ ذیل شاگردوں کے نام اور ایڈریس مجھے حاصل ہوئے۔

۱ مرحوم پریتم ضیائی۔ ایڈیٹر ویر بھارت۔ جالندھر۔
۲ دیس راج سوہل منگر۔ ۴۴۷۔ ماڈل ٹاؤن۔ جالندھر
۳ دوارکا داس تشنہ کام۔ معرفت روزانہ ملاپ۔ جالندھر
۴ ڈاکٹر رام سروپ کوثر۔ بھیروں بازار۔ جالندھر

۵ فقیر چند زار - معرفت ہفتہ وار اخبار سمراٹ - ریلوے روڈ - جالندھر -
۶ مدن موہن سرکش سب ڈائیلر انسپکٹر - ریلوے انجن شیڈ - جالندھر
۷ رام پال شمس - الیکٹرک انڈسٹریز - انڈسٹریل ایریا - جالندھر
۸ اروندکمار - ورما سوپ فیکٹری - بیرون منڈی فنٹن گنج - جالندھر
۹ پورن چند عاصم - ہیڈ کلرک ڈی - ای - او - آفس - جالندھر
۱۰ شودیال سحاب - ۳۷۶۲ - سیکٹر ۲۲ ڈی - چنڈی گڑھ
۱۱ ترلوک ناتھ اظہر - ۲۳۳۷ - سیکٹر ۲۲ سی - چنڈی گڑھ
۱۲ باوا کرشن گوپال مغموم - ۳۱۴۴ - سیکٹر ۱۲ ڈی - چنڈی گڑھ
۱۳ جوالا پرشاد شاہی - یونیورسٹی ڈسپنسری - پنجاب یونیورسٹی - چنڈی گڑھ
۱۴ شری کنول مرحوم - معرفت مسٹر لوپری ایڈوکیٹ ہائی کورٹ - چنڈی گڑھ
۱۵ راجن سرحدی - ۳ راجندر نگر - کینال روڈ - جموں توی
۱۶ بدری ناتھ کامل - ۲۳۷ - گرتھولی محلہ - پٹھان کوٹ
۱۷ کنول ہیر ٹھی - معرفت گجرال اینڈ کمپنی ڈھانگو روڈ - پٹھان کوٹ -
۱۸ پورن چند چاند - ریٹائرڈ پرنسپل - پٹھان کوٹ -
۱۹ شوراج بہار - معرفت وجے برادرز کیمسٹس اینڈ ڈرگسٹس کٹڑہ شیر سنگھ امرتسر -
۲۰ پورن سنگھ ہنر - کٹڑہ باگھ سنگھ - امرتسر -
۲۱ جارج سویٹ معصوم - مشن کمپاؤنڈ - مہان سنگھ گیٹ - امرتسر
۲۲ راملیش کھوسلہ امید - ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی سکول سدھار راجپوتاں امرتسر
۲۳ مرشد بٹروی - چوک مہتہ - ضلع امرتسر
۲۴ بنواری لال نسیم - B۴۰۵ VIII - گوجرمل روڈ - لدھیانہ
۲۵ کندن سنگھ اختر ہرپواسیہ - ۳۲۳/۷ B XI بینجمن روڈ - لدھیانہ

۲۶ ڈاکٹر ہنس راج فراق - معرفت ہفتہ وار چنگاری - فیروز پور

۲۷ رگھبیر چند شاد - ہندو ہائی سکول - سونی پت -

۲۸ اجودھیا پرکاش سرکش - دسوہیہ - ضلع ہوشیار پور

۲۹ بلدیو کرشن اثر - فوڈ کارپوریشن آف انڈیا - دہلی

۳۰ بخشی سرجیت سنگھ بخشی - شملہ

۳۱ دلیپ سنگھ مسافر

۳۲ راقم الحروف رام رتن مضطر - تھریئے وال - براستہ مجیٹھہ - ضلع امرتسر

شاعرِ حرّیت۔ مصوّرِ غم۔ لسان الاعجاز۔ راج کوی (ملک الشعرا)

مرحوم پنڈت میلا رام صاحب وفاؔ

کے اعزاز میں مختلف مقامات پر جو تقریبات منعقد ہوئیں انکی سلسلہ وار تفصیل حسبِ ذیل ہے

۱ جشنِ وفا لدھیانہ ۱۹۶۱ء رسمِ افتتاح سردار پرتاب سنگھ کیروں چیف منسٹر پنجاب نے کی۔
زیرِ صدارت حافظ محمد ابراہیم وزیر آب پاشی حکومتِ ہند۔ نئی دہلی

۲ ۱۹۶۱ء میں حکومت پنجاب کی طرف سے وفاؔ صاحب کو راج کوی کے خطاب سے نوازا گیا اور ایک معقول پنشن ان کے گذارے کیلئے مقرر کی گئی

۳ جشنِ وفا لکھنؤ ۱۹۶۲ء لکھنؤ میں بہت بڑے پیمانے پر جشن منایا گیا۔

۴ ۱۹۶۳ء میں بھاشا وبھاگ پنجاب کی طرف سے وفاؔ صاحب کو "ادیبِ اعلیٰ" کے اعزاز سے نوازا گیا۔

۵ جشنِ وفا لکھنؤ ۱۹۶۴ء زیر سرپرستی مسٹر وی۔ آر موہن۔ میئر لکھنؤ۔

۶ جشنِ وفا لکھنؤ ۱۹۶۸ء انجمن یادگار آرزو کی طرف سے منایا گیا۔ مہمان خصوصی شری چناگوپالا ریڈی گورنر یو۔پی۔ صدارت مسٹر وی۔ آر۔ موہن

۷ جشنِ وفا چنڈی گڑھ ۱۹۷۱ء پنجاب یونیورسٹی چنڈی گڑھ کی بزمِ سخن کی طرف سے منایا گیا۔
شریمتی اوم پربھا جین وزیر خزانہ ہریانہ سرکار نے صدارت فرمائی۔
شری سورج بھان وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے رسم افتتاح ادا کی۔

۸ جشنِ وفا لکھنؤ ۱۹۷۶ء زیرِ صدارت ڈاکٹر چرن سنگھ سابق آبکاری منتری۔ یو، پی گورنمنٹ

دوسرا باب

صحافی شاعر

وفا صاحب نے عمر کے ابتدائی سات آٹھ سال کھیل کود ہی میں گزارے سنہ ۱۹۱۳ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد چار پانچ مہینے نارتھ ویسٹرن ریلوے کے صدر دفتر لاہور میں ملازمت کی۔ اس کے ساتھ ہی یومیہ اُجرت پر اخبارات میں کام کرتے رہے۔ اگلے سال اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے فارمن کرسچن کالج لاہور میں داخل ہو گئے۔ مگر ایک سال کے بعد سلسلۂ تعلیم منقطع کر کے اخبار نویسی کی طرف رجوع کیا۔ چھ سات سال مختلف روزانہ اخبارات میں مترجم اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران میں کئی مہینے اُس زمانے کے مقتدر ترین ماہنامہ "مخزن" کی ایڈیٹری کے فرائض سر انجام دیئے۔ اور پانچ چھ مہینے نیشنل کالج لاہور میں اُردو فارسی کے پروفیسر بھی رہے۔ یہ کالج مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں سرکاری سکولوں اور کالجوں کو چھوڑنے والے طلبا کے لئے کھولا گیا تھا۔

جون سنہ ۱۹۲۳ء میں شیرِ پنجاب لالہ لاجپت رائے کے روزنامہ "بندے ماترم" کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اور سنہ ۱۹۲۳ء کے اخیر تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً لاہور کے کئی اُردو روزناموں کی ایڈیٹری کی۔ ان روزناموں میں خاص طور پر قابلِ ذکر بھیشم اور ویر بھارت تھے۔ یہ دونوں اخبارات یکے بعد دیگرے پنڈت مدن موہن مالوی کی سرپرستی میں جاری ہوئے۔ وفا صاحب کو ان کا بانی ایڈیٹر ہونے

کا شرف ملا۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی کے ساتھ پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور پنجاب دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اُس وقت آپ روزنامہ "ویر بھارت" سے متعلق تھے۔ چونکہ آپ کا آبائی ضلع سیالکوٹ اور آپ کی اخباری سرگرمیوں کا مرکز لاہور پاکستان میں شامل کر دیئے گئے اس لئے یہ مشرقی پنجاب میں ہجرت کر آئے۔ لیکن چند در چند وجوہ سے یہاں نہ ٹھہر سکے اور سنہ ۱۹۴۷ء کی آخری سہ ماہی کے آغاز میں یو۔ پی چلے گئے۔ لگ بھگ ایک سال سہارن پور میں رہے جہاں سے روزنامہ "پنجاب میل" جاری کیا۔ سہارن پور سے اُن کو لکھنؤ بلا لیا گیا۔ اور کان پور میں ایک نکاسی پریس انہیں الاٹ کیا گیا۔ یہاں سے انہوں نے روزنامہ "امرت" جاری کیا۔ یو۔ پی سے قریباً چار سال کے بعد سنہ ۱۹۵۲ء میں دہلی آ گئے۔ سنہ ۱۹۵۳ء میں دہلی سے پنجاب لوٹ آئے اور سنہ ۱۹۵۴ء میں مستقل طور پر جالندھر سکونت پذیر ہو گئے۔

وفا صاحب کی اخباری زندگی مسلسل ہنگامہ آرائیوں اور قربانیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ حُبِ وطن کا جذبہ اُن کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ خدا کے بعد وطن ہی اُن کا سب سے بڑا معبود تھا۔ اس جذبہ کے زیر اثر انہوں نے روزانہ اخبارات کی ایڈیٹری کے دوران غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت و حقارت کی ہمہ گیر آگ بھڑکائی۔ ان کی آتش خیز تحریروں نے بدیشی حکمرانوں کے ایوانوں میں تہلکہ برپا ہو گیا اور ان کی ولولہ انگیز نظموں کو سیاسی جلسوں کی سٹیج پر گا گا کر سینکڑوں نوجوان جیل چلے گئے خود انہوں نے بھی خندہ پیشانی سے قید و بند کی سختیاں اٹھائیں اور بجا طور پر شاعرِ حریت کے لقب سے شہرت یاب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ آزادی کی جنگ میں اپنی اخبار نویسانہ

اہلیتوں اور شاعرانہ صلاحیتوں کا استعمال جس خلوص دلی و بے باکی سے انہوں نے کیا اس کی مثال اردو صحافت کی تاریخ میں شاذونادر ہی ملے گی۔ اس سے بھی زیادہ روشن حقیقت یہ ہے کہ اس جنگ میں کانگرس کی حمایت مکمل طور پر اور اگر مگر کے بغیر وہ اخبار کرتا تھا جس کے ایڈیٹر وفاؔ صاحب ہوتے تھے۔

بہت بڑا اخبار نویس اور بہت بڑا شاعر ہونے کے علاوہ وفاؔ صاحب بہت بڑے اصول پرست اور بہت بڑے خوددار بھی تھے۔ اپنے ضمیر کی آواز کے احترام میں کسی بھی مصلحت کو حائل نہیں ہونے دیتے تھے۔ چنانچہ جب لالہ لاجپت رائے سنہ ۱۹۲۳ء کے آخر میں جیل سے رہا ہونے کے چند ہفتے بعد آل انڈیا ہندو مہاسبھا کے پردھان بن گئے تو وفاؔ صاحب نے "بندے ماترم" کی ایڈیٹری سے استعفیٰ دے دیا۔ اسی طرح جب سنہ ۱۹۲۶ء کے جنرل الیکشن میں مالویہ جی اور لالہ جی نے کانگرس کا مقابلہ کرنے کے لئے کانگرس نیشنلسٹ پارٹی بنائی تو وفاؔ صاحب نے "بھیشم" سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس اصول پرستی و خودداری کی وجہ سے انہیں کئی بار اور ہر بار لگاتار کئی سال بیکار رہنا پڑا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی یہ قربانیاں ان قربانیوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں جو قید و بند کے مصائب اٹھانے کی شکل میں کی جاتی تھیں۔

بحیثیت شاعر وفاؔ صاحب عالم گیر شہرت کے مالک تھے۔ اُن کی شاعرانہ عظمت کا سکہ برصغیر ہند و پاک کے طول و عرض میں رواں ہے۔ اور دونوں ملکوں میں انہیں یکساں طور پر یکتائے فن اور مسلم الثبوت استاد تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور اُن کا کلام سند میں پیش کیا جاتا ہے۔ میرؔ کے سوز و گداز، مومنؔ کے اندازِ تغزل اور داغؔ کی لطف زبان کا دل آویز امتزاج ان کی غزلوں

میں جا بجا نظر آتا ہے۔ اس امتزاج سے جو وجدانی رنگ پیدا ہوتا ہے وہ اُن کے ذاتی جذبات و محسوسات۔ مجلسی رجحانات اور روزمرہ کے واقعات سے متاثر ہو کر بجائے خود ایک نیا رنگ بن گیا ہے اور ان کا مخصوص رنگ مانا جاتا ہے۔ ان کی کم ازکم تعریف یہ ہے کہ صفِ اوّل کے شعرا میں وہ بہتوں سے آگے تھے اور کسی سے پیچھے نہیں تھے۔

اُن کا تغزلیہ کلام تمام و کمال چوٹ کھائے ہوئے اور درد بھرے دل کی آواز ہے۔ اور بدرجۂ غایت اندوہگین بھی ہے اور اندوہ آفریں بھی۔ اسے پڑھنے سننے والا یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ صاحب صحیح معنوں میں شاعرِ غم ہیں اور اندوہ و ملال اور حُزن و تحسّر ان کا جزوِ طبیعت ہیں۔

ان کا معیارِ تغزل بہت ہی بلند ہے۔ جن پابندیوں کے ساتھ یہ شعر کہتے ہیں ان کو کامیابی سے نباہنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ یہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُسے حسین ترین انداز میں کہنے کی قدرت رکھتے ہیں۔ حسنِ بیان کے علاوہ روزِ بیان و ندرت بیان بھی اُن کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جو کچھ لکھتے ہیں وہ اُن کے دل سے نکلتا ہے۔ اس لئے اصلیت اور واقعیت پر مبنی اور درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے اور ان کی قادرالکلامی کے اعجاز سے سحر حلال بن جاتا ہے۔ اُن کے کلام میں بھرتی کے اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اس کا انتخاب کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ ایسے نادر اشعار جو سنتے ہی دل میں اتر جاتے ہیں اور زبان پر بھی چڑھ جاتے ہیں جتنے ان کے کلام میں پائے جاتے ہیں اتنے کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتے۔

غزلوں کی طرح اُن کی نظمیں بھی کمالِ قادرالکلامی کی آئینہ دار ہیں اور اُن میں سے بیشتر اردو شاعری کے حیرت انگیز شاہکاروں میں شمار ہوتی ہیں۔

شعرائے اُردو کے ہر دور میں ایسی مثالوں کی نمایاں کمی ہے کہ ایک بلند پایہ غزل گو بلند پایہ نظم نگار یا ایک بلند پایہ نظم نگار بلند پایہ غزل گو بھی ہو۔ گنتی کے جن شعرا نے غزل میں بھی داد کمال دی ہے اور نظم میں بھی اُن میں وفا صاحب کا نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہے۔ ان کی نظموں میں وہی فصاحت و بلاغت اور وہی سلاست و روانی پائی جاتی ہے جو اُن کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں کہ اُن کا مرتبہ بحیثیت غزل گو زیادہ بلند ہے یا بحیثیت نظم نگار۔

اُن کی ادبی کسوٹی اتنی صحیح ہے کہ اس پر بڑے بڑے استادوں کی خامیاں بھی فوراً نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مگر شعر و سخن کی محفلوں میں یہ مُبتدیوں کو بھی بڑی فراخ دلی سے داد دیتے۔ صرف یہی نہیں جو شخص بھی اپنی شعری تصنیف پر پیش لفظ لکھوانے کے لئے اُن تک رسائی پا سکتا اس کی تعریف میں حد اعتدال سے بہت آگے نکل جاتے اور کئی حالتوں میں مبالغہ کی حدود کو بھی پار کر جاتے۔ ان کے اس طرزِ عمل کی تہہ میں غالباً یہ خیال کارفرما ہوتا کہ اُردو کو زندہ رکھنے کے لئے اردو شاعری کی طرف راغب ہونے والوں کی حوصلہ افزائی اور ناموری کے آرزومندوں کی تسکینِ خاطر وقت کی اہم ضرورت ہے۔

علّامہ مرحوم نیاز فتحپوری کے الفاظ میں ایک وقت وہ آنے والا ہے جب نہ وفا یہاں ہوں گے نہ ہم۔ لیکن ان کے اشعار ضرور باقی رہ جائیں گے زبانوں پر بھی اور دلوں میں بھی۔ بہت ہی خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں مشاعروں میں اور دوسری ادبی محفلوں میں وفا صاحب کی نازک خیالیوں اور سحر طرازیوں سے بالمشافہ لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور جو

وقت آنے کے بعد جس کی پیش گوئی علاّمہ نیاؔز نے کی ہے بڑے فخر کے ساتھ کہا کریں گے کہ ہم نے اس عظیم شاعر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سُنا۔

تیسرا باب

رنگِ تغزّل

اُردو شاعری کے جُملہ اصناف میں جو امتیازی مرتبہ غزل کو حاصل ہے وہ کسی دوسری صنف کو آج تک نصیب نہیں ہوا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ اُردو شاعری کا ذکر آتے ہی میرا ذہن غزل کی طرف مائل ہو جاتا ہے ۔غزل کو میں اُردو شاعری کی آبرو سمجھتا ہوں۔ ہماری تہذیب غزل میں اور غزل ہماری تہذیب میں ڈھلی ہے۔ دونوں کی سمت و رفتار، رنگ و آہنگ اور وزن و وقار ایک دوسرے سے ملا ہے" ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو زبان کے اِس دَورِ انحطاط میں بھی غزل بدستور اپنے اندر دلکشی و دلفریبی رکھتی ہے۔ اور بے شمار لوگوں کے لئے ریڈیو۔ ٹیلی ویژن ۔ اخباروں ، رسالوں وجد و سماع کی مجلسوں۔ یاروں کی صحبتوں اور بیاہ شادی کی محفلوں میں تفریحِ طبع اور روحانی مسرّت کا باعث ہوتی ہے۔ غزل کی مقبولیت کے بہت سے اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ غزل آسانی سے کہہ لی جاتی ہے اور جو ذرا بھی موزوں طبع ہو غزل آسانی سے کہہ سکتا ہے۔ دوسری آسانی یہ ہے کہ غزل کے سُننے اور اُس پر سر دُھننے والے ہر جگہ مل جاتے ہیں جو حسن و محبت کی باتوں اور [illegible] اتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔

اکثر کہا جاتا ہے کہ غزل ہی شاعری کی ابتدا ہے اور غزل ہی انتہا یعنی بیشتر شاعروں نے اپنی شاعری کا آغاز غزل ہی سے کیا ہے لیکن غزل کی انتہا تک پہنچنا ہر شاعر کا مقدر نہیں۔

غزل کی معراج کیا ہے اور کس طرح نصیب ہوتی ہے۔ اس کے متعلق مرحوم مولانا نیاز فتحپوری رقمطراز ہیں "غزل کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ بغیر کسی تکلف کے ہمارے ذہن و دماغ میں اتر جائے اور ہم کو اس کے سمجھنے میں یا اس سے لطف حاصل کرنے کے لئے یہ نہ سوچنا پڑے کہ شاعر کیا کہتا ہے۔ لیکن اس خصوصیت کا قایم رکھنا آسان نہیں۔ اس کے لئے زبان کی مہارت۔ اسلوبِ بیان کی روانی۔ جذبات کی پاکیزگی۔ لب و لہجہ کی نرمی و شیرینی اور سب سے زیادہ محبت کرنے والے دل کی ضرورت ہے۔ مگر ان سب کا اجتماع بڑی خداساز بات ہے۔ آگے چل کر انہوں نے فرمایا ہے کہ وفا صاحب کے کلام میں یہ تمام خصوصیات اتنے اچھے توازن کے ساتھ پائے جاتے ہیں کہ اگر ہم انہیں وفا صاحب کے مختص انفاسِ خوشدلی سے تعبیر کریں تو یہ جسارت غالباً ناروا نہ سمجھی جائے گی۔"

اس میں شک نہیں کہ ایک وہ وقت آنے والا ہے کہ جب نہ وفا یہاں ہوں گے نہ ہم۔ لیکن ان کی غزلوں کے اشعار ضرور باقی رہ جائیں گے زبانوں پر بھی اور دلوں میں بھی ؎

"پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ"

نیاز صاحب کے اس ارشاد میں الفاظ "اچھے توازن" خاص طور پر قابلِ توجہ ہیں۔ اور میرا خیال نہیں کہ نیاز صاحب نے کسی اور شاعر کو اتنے بلند الفاظ میں خراجِ تحسین ادا کیا ہو۔

ہمارے اس مقالے کا موضوع وفا صاحب کی غزلیہ شاعری ہے اور وفا صاحب کی شاعری نہیں کیونکہ موخر الذکر عنوان میں مضمون کا احاطہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔ اس میں وفا صاحب کی غزلیہ شاعری نظمیہ شاعری

اور ملکی - قومی - سیاسی شاعری بھی آجاتی ہے - لیکن اس مقالے میں ہماری توجہ وفا صاحب کی صرف غزلیہ شاعری ہی پر مرکوز ہوگی -

ہم اپنے ناظرین کو بتانا چاہتے ہیں کہ اردو شاعری کی دنیا میں ایسے شعرا کی تعداد بہت کم ہے جو غزل اور نظم دونوں اصناف شاعری میں یکساں طور پر دادِ سخن دے سکتے ہیں - عملی طور پر صورت حال یہ ہے کہ میدانِ غزل کا شہسوار نظم کی راہگزاروں میں لڑکھڑاتا نظر آتا ہے اور بحرِ نظم کا شناور جوئے غزل میں نو آموز تیراک دکھائی دیتا ہے - لیکن وفا صاحب کے کلام بلاغت نظام کو دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وفا صاحب بحیثیت غزل گو زیادہ اونچے مقام پر ہیں یا بحیثیت نظم نگار - امر واقعہ یہ ہے کہ وفا صاحب کی ہر نظم بجائے خود ایک گراں بہا شاہکار ہوتی ہے - ہر نظم میں وہی روانی - وہی سلاست اور وہی برجستگی پائی جاتی ہے جو اُن کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے - ان کی نظموں کے اکثر و بیشتر اشعار میں وہی غزلیت اور شعریت پائی جاتی ہے جو ان کی غزلوں کے اشعار میں ہوتی ہے چنانچہ ہم اپنے آیندہ مضمون میں وفا صاحب کی نظمیہ شاعری کا علیحدہ طور پر جائزہ لیں گے -

آپ اس بات پر ہم سے اتفاق کریں گے کہ صفِ اوّل کے چند برگزیدہ شاعر غزل گوئی میں اپنا خاص مقام رکھتے ہیں لیکن نظم میں ان کی وہ بات نہیں - مثال کے طور پر حسرتؔ - فانیؔ - اصغرؔ - جگرؔ - فراقؔ کے نام لیے جا سکتے ہیں - اسی طرح ایسے بلند مرتبہ شعرا بھی ہیں جو نظم لکھنے میں درجۂ کمال رکھتے ہیں مگر غزل میں ان کی وہ شان نہیں - اس ضمن میں محرومؔ - جوشؔ ملیح آبادی - ساغرؔ نظامی ۔ احسان؟ ... سیمابؔ ... ساحرؔ؟ ...

سرور جہاں آبادی - برقؔ دہلوی - چکبستؔ - رواںؔ وغیرہ وغیرہ ہیں - لیکن وفا صاحب ہی ایک ایسے شاعر ہیں جو بلند پایہ غزل گو بھی ہیں اور با کمال

نظم نگار بھی۔ اصغر کے ہاں تخیل زیادہ اور جذبہ کم ہے۔ جگر کے ہاں جذبے کی شدت ہے۔ لیکن وفا صاحب کو قدرت کی طرف سے تخیل۔ جذبہ اور اُسلوب بیان کا ایک ایسا متوازن امتزاج ودیعت ہوا ہے جو شاذونادر ہی کسی دوسرے شاعر میں نظر آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں سرتاپا مرصّع اور فصاحت و بلاغت کا نہایت حسین مرقع پیش کرتی ہیں۔

یہ خصوصیت کچھ اُردو شاعری ہی پر موقوف نہیں۔ فارسی شاعری میں بھی یہی حال ہے۔ ایران میں جس قدر نامی گرامی شعرا گزرے ہیں وہ خاص خاص انواعِ شاعری میں کمال رکھتے تھے۔ مثلاً فردوسی رزم کا مردِ میدان ہے۔ عشقیہ شاعری کی طرف اُس نے اپنی توجہ مبذول ہی نہیں کی۔ سعدی اخلاقی اور عشقیہ شاعری کے پیغمبر ہیں۔ خیام نے صرف فلسفہ کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے۔ حافظ کا کلام تمام و کمال غزلیات پر مشتمل ہے۔ لیکن نظامی ایک ایسا شاعر ہے جو رزم۔ بزم۔ فلسفہ۔ عشق۔ اخلاق وغیرہ ہر میدان میں قادر الکلامی کے جوہر دکھاتا ہے۔

وفا صاحب کا ملکہ شاعری فطری اور جبلی ہے۔ آپ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ پرائمری سکول کے زمانہ طالب علمی ہی میں آپ نے اس خداداد جوہر سے اپنے معلمین اور ہم جماعتوں کو متحیر کیا۔ شعر و شاعری سے مناسبت کے آثار گیارہ بارہ سال کی عمر میں نمودار ہو گئے تھے۔ لیکن آپ نے شعر کہنا پندرہ سولہ سال کی عمر میں شروع کیا۔ اور میٹرک پاس کرنے سے پہلے ہی کافی حد تک پختہ مشق بھی ہو گئے تھے اور خوش مشق بھی۔ جب دسویں جماعت میں پڑھتے تھے تو حضرتِ داغ کے مایۂ ناز شاگرد پنڈت راج نرائن ارمان دہلوی سے بذریعہ خط و کتابت رشتہ تلمذ قائم کیا۔ ارمان صاحب آپ کی خوش مشقی اور شاعرانہ

ذہانت سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے تین چار بار اصلاح دینے کے بعد آپ کو لکھ بھیجا کہ طبیعت بہت موزوں ہے۔ اصلاح کی چنداں ضرورت نہیں۔ اپنے کلام پر خود ہی نظر ثانی کر لیا کرو۔

وفا صاحب کی غزلوں میں میر کے سوز و گداز مومن کے اندازِ تغزل اور داغ کے لطفِ زبان کا حسین اور متوازن امتزاج پایا جاتا ہے۔ اس امتزاج سے جو رنگ پیدا ہوتا ہے وہ آپ کے ذاتی جذبات و محسوسات مجلسی و سیاسی رجحانات اور روزمرّہ کے واقعات کے زیر اثر بجائے خود ایک پر کشش عنبار رنگ بن گیا ہے اور آپ کا رنگ مانا جاتا ہے۔

آپ کا غزلیہ کلام تمام و کمال چوٹ کھائے ہوئے اور درد بھرے دل کی آواز ہے اور بدرجۂ غایت اندوہگیں بھی ہے اور اندوہ آفریں بھی۔ اسے پڑھنے یا سننے والا یہ تاثر لئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اندوہ و ملال اور حزن و تحسّر آپ کا جزوِ طبیعت ہیں۔ موسم بہار کے مناظر کتنے نظر نواز اور دلکشا ہوتے ہیں مگر آپ نے اس موسم کی آمد کے آثار بیان کرتے ہوئے ان مناظر کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے اور کہا ہے ؎

صیّاد بھی پہنچ گیا گلچیں بھی باغ میں
اے ہمصفیر آ گیا موسم بہار کا

جو سخن دوست اصحاب آپ کے افتادِ طبع سے پوری طرح واقف نہ ہوں یہ فرض کر سکتے ہیں کہ آپ انگریزی کے اس مشہور مقولے پر عمل پیرا ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ المناک اور الم انگیز نغمے سب نغموں سے زیادہ میٹھے اور پسندیدہ ہوتے ہیں۔ اس لحاظ سے آپ صحیح معنوں میں شاعرِ غم ہیں۔ آپ کے سارے غزلیہ کلام میں صرف ایک شعر ؎

یہ کون سبز کو نکلا ہے بام پر شب ماہ
یہ رات نور کے سانچے میں ڈھل گئی کیسی

شگفتگی و خوش دلی کا حامل ہے۔ مگر خال خال تشبیہات کسی قاعدہ کے اثبات کا ثبوت ہوتے ہیں۔ نظر بریں یہ بات کہ وفا صاحب نے ساری عمر میں اس نوعیت کا صرف ایک ہی شعر کہا ہے آپ کے شاعر غم ہونے کی اور بھی روشن دلیل ہے۔

وفا صاحب کا معیار تغزل بہت ہی بلند ہے۔ جن پابندیوں کے ساتھ آپ شعر کہتے ہیں اُن کو کامیابی سے نباہنا ہر شاعر کے بس کی بات نہیں۔ آپ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اُسے حسین ترین انداز میں کہنے کی قدرت رکھتے ہیں حُسنِ بیان کے علاوہ زورِ بیان اور ندرتِ بیان بھی آپ کے کلام کی امتیازی خصوصیت ہے۔ جو کچھ کہتے ہیں آپ کے دل سے نکلتا ہے۔ اس لئے اصلیت اور واقعیت پر مبنی اور درد و اثر میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ اور آپ کی نادر الکلامی کے اعجاز سے سحر حلال بن جاتا ہے۔ آپ کے کلام میں بھرتی کے اشعار نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس لئے اس کا انتخاب کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی ہے۔ ایسے نادر اشعار جو سنتے ہی دل میں اُتر جاتے اور زبان پر بھی چڑھ جاتے ہیں جتنے آپ کے کلام میں ہیں اتنے کسی اور شاعر کے کلام میں نظر نہیں آتے۔ وفا صاحب کے کلام کو دائیں بائیں جس پہلو سے بھی دیکھا جائے اس میں کوئی چول ڈھیلی نہیں پائی جائے گی۔ آپ کا کلام ہر لحاظ سے بے عیب۔ گٹھا اور مضبوط ہے۔ آپ کی فکر و تخئیل بہت وسیع اور آپ کے جذبات میں بے حد زرخیزی ہے۔ تنوع اور توانائی ہے

شاعرانہ تعلّی کی مثالیں اُردو شاعری میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ اس

اس کا ارتکاب بلند پایہ شعرا نے بھی کیا ہے اور اوسط درجے کے شاعروں نے بھی۔ غزلوں میں ایک دو دفعہ وفا صاحب بھی اس کے مرتکب ہوئے ہیں۔ مگر آپ کا اندازِ تعلی دوسرے شعرا سے الگ قسم کا ہے۔ آپ کی ایک غزل کا مقطع ہے ؎

کس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفا
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

پہلے مصرع میں لفظ "اب" اور دوسرے مصرع میں لفظ "بھی" کے استعمال سے اظہارِ تعلی اظہارِ انکسار میں بدل گیا ہے۔ اور اردو شاعری کی موجودہ حالت پر اشکباری کرتا نظر آتا ہے۔

وفا صاحب کے مداحوں اور عقیدت مندوں کو بجا طور پر شکوہ ہے کہ ایسے عالی مرتبہ سخن طراز کو اکثر نقادانِ فن نے قصداً اور بے جا طور پر نظر انداز کیا ہے۔ اس سلسلہ میں آخری مغل تاجدار کے زمانے کی ایک مجلسِ شعر و سرود کا ذکر کرتے ہوئے وفا صاحب نے ذیل کا دلچسپ منظر حوالۂ قلم کیا ہے۔ اس مجلس میں غالب کے عین سامنے غالب کے کٹر ادبی مخالف اور سخت گیر نکتہ چیں مفتی صدرالدین آزردہ بیٹھے تھے جو مرزا غالب کی مخالفت میں اس حد تک چلے جاتے تھے کہ اس کا اندازہ اُن کے اس شعر سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے ایک مشاعرے میں خاص طور پر مرزا غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پڑھا تھا ؎

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مجلسِ شعر و سرود میں جو فارسی غزل گائی جا رہی تھی وہ اتفاق سے مرزا غالب ہی کی تھی۔ اور مفتی صاحب اس غزل کے ہر شعر پر جھوم جھوم کر

واد دے رہے تھے۔ جب اس غزل کا مقطع آیا تو مفتی صاحب کی آنکھیں مرزا غالب کی مسکراتی آنکھوں سے ملیں اور اعتراف شکست کے انداز میں بارِ ندامت سے جھک گئیں غالب کی غزل کا مقطع یہ تھا ؎

تُو اے کہ معتقدِ شاعرانِ پیشینی
مباش منکرِ غالبؔ کہ در زمانۂ تُست

وفا صاحب نے اسے اُردو میں ڈھال دیا ہے۔ اور اپنی ایک فصیح و بلیغ غزل کا مقطع بنالیا ہے جو یہ ہے ؎

نہ اس لئے ہو وفاؔ کے کمال سے مُنکر
کہ یہ غریب ہے شاعر ترے زمانے کا

دوسرے مصرعے میں لفظ "غریب" پُر معنی ہے اور معنی خیز بھی۔ غالب کے مقطع میں مفتی صاحب کے خلاف جو شکوہ ہے وہ عہدِ رواں کے اُن نقادوں پر بھی اطلاق پذیر ہوتا ہے جو اپنے تنقیدی مضامین میں دانستہ یا سہواً وفا صاحب کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ یہ نقاد اپنی سُخن فہمی کا سِکہ بٹھانے کے لئے غالب اور اقبال ہی کے کلام کا سہارا لیتے ہیں۔ اور دورِ حاضر کا غالب وفا صاحب جیسا عظیم شاعر انہیں نظر نہیں آتا۔

وفا صاحب کی پوری غزل بغیر ایک قافیہ اور عطف و اضافت سے کاملاً پاک ہے۔ سُخن فہم حضرات اسے پڑھیں اور لُطف اندوز ہوں ؎

نہیں نہیں نہیں اب وہ پلٹ کے آنے کا
زمانے والوں میں چرچا ہے جس زمانے کا

نہیں نہیں وہ نہیں جس کا خواب دیکھا تھا
کچھ اور رنگ ہے بدلے ہوئے زمانے کا

ہمہ غرور، سراپا فتور، محض فجور
خدا سے دُور ہے انسان اس زمانے کا

نری فضول سرائی سے اُٹھنا ہے یہ سوال
کہ تو عجوبہ ہے اے شیخ کس زمانے کا

مرے ترانے میں ہے تان ہر زمانے کی ۔۔۔ مرا ترانہ ترانہ ہے ہر زمانے کا
رہیں گے ہو کے زمانے کی بے رخی کا شکار ۔۔۔ جو لوگ مرخ نہیں پہچانتے زمانے کا
نہ اس لئے ہو وفاؔ کے کمال سے منکر ۔۔۔ کہ یہ غریب ہے شاعر ترے زمانے کا

وفاؔ صاحب کی زندگی کے مختلف جلوؤں کو موٹے طور پر دو عنوانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک ادبی دوسرا اخباری اور سیاسی۔ آپ کی زندگی کا ہر پہلو دوسرے پہلو پر اثر انداز بھی ہوا ہے اور اس سے اثر پذیر بھی۔ بہ الفاظ دیگر دونوں پہلو ایک دوسرے کے تابع نظر آتے ہیں اور معاون بھی۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ آپ کا رجحان غالب شاعری کی طرف ہے یا اخبار نویسی اور سیاست کی طرف۔ مولانا تاجور مرحوم کہا کرتے تھے کہ پنڈت میلارام وفاؔ قدرت سے شاعر پیدا ہوئے مگر ان کی شاعری کو اخبار نویسی نے خراب کیا اور ان کی اخبار نویسی کو ان کی سیاست نے۔ چنانچہ آپ کی غزلوں میں کافی تعداد سیاسی رنگ کے اشعار کی ہے۔ مگر آپ کے سیاسی اشعار میں بھی بڑے حسین انداز سے رنگِ تغزل کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔

ہمارے انگریز حاکم پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی مذموم پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اکثر دنگا فساد کرواتے رہے، اور انگریز حکمرانوں کے ایما پر اسلام کے نام نہاد اجارہ داروں کی طرف سے اکثر یہ نعرہ بلند ہوتا رہا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ دوسری طرف بعض ہندو لیڈر بھی انگریز کی اس پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے ہندوؤں کو مسلمانوں کی مخالفت پر اُبھارتے رہے۔ وفاؔ صاحب کا ذیل کا شعر اسی خیال کا آئینہ دار ہے ؎

خدا کے نام پر دست و گریباں ہیں خدا والے ۔۔۔ بہت ہے جس قدر ذکرِ خدا خوفِ خدا کم ہے

اسی طرح کا ایک اور شعر دیکھئے ؎

کیا نفرقہ انگیز ہے بیداد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

کتنا وسیع مضمون اس شعر میں مضمر ہے ۔ یہ بات عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے کہ جن لوگوں پر ظلم ہوتا ہے وہ باہمی اختلاف کو بالائے طاق رکھ کر اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ظالم کے خلاف متحدہ محاذ بنا لیتے ہیں ۔ مگر انگریز حکمران کچھ ایسی ہوشیاری اور عیاری سے ظلم کرتے تھے کہ ہندو مظلوم اور مسلمان مظلوم ان کے خلاف متحد ہونے کی بجائے حکومت کو تقویت پہنچاتے تھے ۔ اتنے وسیع مضمون کو اتنے مختصر الفاظ میں بیان کرنا دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے ۔ اسی مضمون سے ملتا جلتا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے ؎

وہ سازش غیر کے ایما پہ تھی شیخ و برہمن کی !
جو دیکھی ہے مری آنکھوں نے جنگِ کفر و دیں برسوں

پھوٹ ڈالنے اور پھوٹ ڈال کر حکومت کرنے کی برٹش پالیسی کو جس خوش اسلوبی سے ننگا کیا گیا ہے وہ اس امر کے باوجود بیان و تشریح کی محتاج نہیں کہ ذیل کے اشعار معیارِ تغزل پر پورے اترتے ہیں اور ان میں غزل کا مزاج ملحوظ رکھا گیا ہے ؎

بنایا سب کو پھر کچھ اس طرح اس شوخ پُرفن نے
ہر اہلِ انجمن سے پھر ہر اہلِ انجمن بگڑا
بگاڑ ایسا نہ دیکھا تھا کبھی پہلے ان آنکھوں نے
دماغِ شیخ بگڑا اور مزاجِ برہمن بگڑا

برٹش حکومت کے عہد میں ہندوستانیوں پر تحریر و تقریر کی جو پابندیاں عاید تھیں انھیں مندرجہ ذیل شعر میں کتنی فصاحت اور وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ؎

بس اب میں رات دن کی یہ اذیت سہہ نہیں سکتا
کہ سب کچھ دیکھتا ہوں اور کچھ بھی کہہ نہیں سکتا

اگلے شعروں میں بڑی صراحت سے بتایا گیا ہے کہ آزادئ وطن کی جدوجہد میں حصولِ مقصد کے لئے مصائب و مشکلات کا سامنا کرنے پر آمادہ ہونا ضروری ہے ؎

اماں آغوشِ ساحل میں کبھی اس کو مل نہیں سکتی　　جو دریا میں تلاطم کے تھپیڑے سہہ نہیں سکتا
فنا آمادگی میں ہے وفؔا رازِ بقا پنہاں　　جسے مرنا نہیں آتا وہ زندہ رہ نہیں سکتا

ذیل کے اشعار میں کتنی بے باکی سے بدیسی حکمرانوں کو وارننگ دی گئی ہے اور متنبہ کیا گیا ہے کہ بغاوت کی آگ طاقت سے دبائی نہیں جا سکتی۔ اور یہ آگ اندر ہی اندر سلگتی ہوئی انجام کار ہولناک شکل اختیار کر کے سارے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے آئے گی ؎

تشدد سے کہاں دبتی ہے مظلوموں کی بے چینی
کہ خس میں شعلۂ بیتاب پنہاں رہ نہیں سکتا

تشدد پر نہ تکیہ اے تشدد کیش کر اتنا　　تشدد سے مآل کار تیرا بھی زیاں ہوگا
تشدد پر اتر آئیں گے اہلِ ہند مجبوراً　　تشدد کا جواب آخر تشدد بے گماں ہوگا

مندرجہ بالا اشعار جس غزل سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اس کا آخری شعر وفؔا صاحب کی سیاسی دور بینی کا آئینہ دار ہے۔ اور کسی بہت بڑے سیاسی مبصر کی زبان سے نکلی ہوئی پیش گوئی کی حیثیت رکھتا ہے ؎

حماقت ہے سراسر جرم ٹھہرانا بغاوت کو　　کہ باغی آج کا ہے جو وہ کل کا حکمراں ہوگا

کہنے کی ضرورت نہیں کہ بھارت کے موجودہ حکمران انگریزی عہدِ حکومت

ہی کے باغی ہیں۔

وفا صاحب کی ایک اور غزل میں سیاسی رنگ کے دو تین شعر نظر آ
ہیں۔ آزاد بھارت میں سرکار کی طرف سے ملکی خوشحالی کے جو سبز باغ دکھائے
جاتے ہیں اس کے متعلق وفا صاحب ارشاد فرماتے ہیں ؎

اے کہ ویرانوں میں گلزار کھلاتے ہو تم — اگلے گلزار بدل جائیں نہ ویرانوں میں
اے وفا دور بہت دور ہے وہ خوش حالی — جو نظر آتی ہے سرکار کے اعلانوں میں

مزدور اور سرمایہ دار کے مسئلے کی اہمیت کو بھانپتے ہوئے وفا صاحب
نے سرمایہ دار فرعون مزاج کو متنبہ کرنا چاہا ہے ؎

سُن لیں جو مستِ مئے عیش ہیں ایوانوں میں
زندگی کروٹیں لیتی ہے سیہ خانوں میں

وفا صاحب کی شاعری کا اصلی رنگ روپ۔ جوبن اور نکھار آپ کے
ایسے اشعار میں ملتا ہے جن میں حسن و عشق کے واردات و کیفیات کی تفسیر
ہے۔ اندازہ نہیں لیا جا سکتا کہ یہ شخص جو شکل و صورت اور بول چال میں
دیہاتی گنوار لباس پوشاک میں ضرورت سے زیادہ سادہ اور لاپرواہ ہے اپنے
سینے میں ایسا دل رکھتا ہے جس میں محبت سے لبریز ختم نہ ہونے والا ایک سرچشمہ
ٹھاٹھیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔ دیکھنے میں گمان تک نہیں ہوتا کہ یہ شخص شعر
کہنا تو درکنار شعر سمجھ بھی سکتا ہوگا۔ آپ کی یہ ہیئت کذائی مدت تک آپ کی
ادبی طاقتوں کا حجاب اکبر بنی رہی۔ حیرت ہوتی ہے کہ یہ بظاہر سادہ لوح
شاعر عشق و محبت کی کتنی باتیں اور گھاتیں جانتا ہے۔ وارداتِ قلبی جو
عاشق پر وقتاً فوقتاً گزرتے ہیں جتنے وفا صاحب کے کلام میں پائے جاتے ہیں
اتنے اور کہیں نہیں ملتے۔ محبت کے باریک سے باریک رموز و نکات ایسی

بے تکلفی سے بیان کر جاتے ہیں کہ پڑھنے سننے والے عش عش کر اٹھتے ہیں بطور نمونہ ذیل کے کچھ شعر ہدیۂ ناظرین ہیں ؎

زیاں کرنا ہے جی کا روٹھنا اے سنگدل تجھ سے
وہ جن کو روٹھ کر کوئی منالے اور ہوتے ہیں

حُسن و عشق کی لڑائی برابر کی لڑائی نہیں ہوتی۔ اس لڑائی میں عشق ہی کو ہتھیار ڈالنے پڑتے ہیں۔ اپنی ضد پر ڈٹے رہنا حُسن کے لئے بالکل آسان ہے مگر عشق کے لئے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ اور جان لیوا بھی۔ اس صورتِ حال کو وفاؔ صاحب نے ذیل کے شعر میں بڑی خوش اُسلوبی سے ادا کیا ہے ؎

نادان نہ بن عہدہ برآ ہو نہ سکے گا
اس نازِ مجسّم سے وفاؔ نازِ محبّت

تجھ کو ہیں نالے گراں اور مجھ کو مشکل ضبطِ غم
نازکی اپنی بھی دیکھ اور میری ناچاری بھی دیکھ

عاشق اس شعر میں معشوق سے کہتا ہے کہ میرے غم کی شدّت ضبط کی حد سے گزر چکی ہے اور میرے لئے اس شدّتِ غم کو برداشت کرنا ناممکن ہو گیا ہے دوسری طرف تیری نزاکت میری گریہ و زاری کی تاب نہیں لاسکتی اس لئے آ پس میں سمجھوتہ کرلیں اور اسی میں بہتری سمجھیں کہ کچھ میں جھک جاؤں اور کچھ تو جھک جائے ؎

بڑا بیداد گر وہ مہ جبیں ہے
مگر اتنا نہیں جتنا حسیں ہے

حسن کے سنگین سے سنگین ستم کو اس انداز سے انتی انتہا تک اور ایسی خوش اُسلوبی کے ساتھ جائز ٹھہرانا وفاؔ صاحب ہی کا حصّہ ہے عشق

پر ظلم کرنا حسن کا حق ہے۔ اس لئے محبوب جتنا زیادہ حسین ہوا اتنا ہی زیادہ ظلم کرنے میں حق بجانب ہوگا۔

مہرباں پا کے بھی وفا اُن کو
حرفِ مطلب ادا نہیں ہوتا

بڑے مرتبہ کے لوگوں سے کوئی التجا کرنے کے لئے موقع محل دیکھنا آدابِ محفل میں داخل ہے اور التجا کو موثر بنانے کا ذریعہ بھی۔ محبوب کا مہرباں ہونا عاشق کو دل کی بات کہنے کا حوصلہ دیتا ہے۔ لیکن محبوب کی عظمت کا احساس عاشق کو لب کھولنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اتنے وسیع مضمون کو وفا صاحب نے کتنے مختصر الفاظ میں ادا کر دیا ہے۔

دیر اُس نے بھی کی تو آتے نہیں
صبر تجھ سے بھی اے وفا نہ ہوا

محبوب کا آنے کا وعدہ کر کے آنے میں دیر کرنا عاشق کے لئے بلا شبہ تاب شکن ہوتا ہے۔ اور اس پر ایک ایک لمحہ گراں گذرتا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرع میں ظاہر ہوتا ہے کہ عاشق نے انتظار کی تاب نہ لا کر خودکشی کر لی ہے ایفائے وعدہ میں دیر کرنا محبوبوں کا عام [illegible] ہے۔ اس معمول کی روشنی میں عاشق کا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ خودکشی کرنے کی بجائے محبوب کے آنے کا انتظار کرے۔ عاشق کو انتظار کے عذاب میں مبتلا کرنے کا معمول معشوقانہ ادا نہیں بلکہ محبوب جزوِ فطرت ہے بالفاظ دیگر محبوب ارادتاً ایسا نہیں کرتا بلکہ خود بخود ایسا ہو جاتا ہے۔

ساعتوں کی نہیں بات لمحوں کی ہے
جسم سے رُوح پرواز کر جائے گی
تم ہماری خبر کو تو کیا آؤ گے
اب تمہیں کو ہماری خبر جائے گی

اس شعر میں "خبر کو آنا" بیمار پرسی کے لئے آنے کا ہم معنی ہے۔ اور "خبر کا جانا" محبوب کو بیمار عاشق کے مر جانے کی اطلاع کے مترادف ہے۔

لفظوں کے بے تکلف پھیر بدل سے کتنا پُرسوز۔ درد انگیز۔ فصیح و بلیغ مضمون پیدا ہو گیا ہے۔ لمبی بحر کا ترنم شعر کے اثر میں چار چاند لگا رہا ہے۔ محبوب کی طرف سے دیر ہو جانے کا معمولی ارادتاً نہیں بلکہ رفتار اور رکھ رکھاؤ کا خیال وقت کی پابندی میں حائل ہوتا ہے ؎

یوں سا لگا کہ مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا
جب عرضِ مدعا پہ وہ شرما کے رہ گئے

اظہارِ آرزو پر محبوب کے شرمسار ہو جانے سے عاشق کے دل پر جو گزرتی ہے وہ اتنی پریشان کن ہوتی ہے کہ عاشق اپنی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے اور اسے اپنی جسارت پر ندامت ہوتی ہے۔ پہلے مصرع الفاظ "گھڑوں پانی پڑ گیا" خاص طور پر قابلِ داد ہیں۔ ان الفاظ میں ذلت کے احساس کا اظہار کرنا کمالِ بلاغت ہے ؎

آبستا ہے دل میں کوئی نادیدہ پری رُو
ہو جاتا ہے یوں بھی کبھی آغازِ محبت

یہ شعر وفا صاحب کے اس خیال کا آئینہ دار ہے کہ جذبۂ عشق ہر انسان کے دل میں پنہاں ہوتا ہے۔ اور اُس وقت خود بخود اُبھر آتا ہے جب اُس کے تصوّر کی شکل سے ملتی جلتی کوئی شکل اُسے نظر آجاتی ہے ؎

دل کو بندھا گئی، تھی جو تیری نگاہِ ناز
نکلی ہے کس قدر وہ اُمیدِ کرم غلط

فصاحت کے سانچے میں ڈھلا ہوا یہ سراپا بلاغت شعر وفا صاحب کی قادر الکلامی کا بہت ہی پیارا اور نادر معجزہ ہے۔ محبوب کی نگاہِ ناز سے عاشق کے دل میں اُمید وں کے بیلیں تن گئی، لیکن اتفاق سے محبوب کی

نگاہِ ناز کے زیر اثر وہ مستقبل کے خوش آیند خواب دیکھنے اور خواب ہی کے سے عالم میں جانفزا خوشیوں کے تاج محل تعمیر کرنے لگتا ہے۔ محبوب تو عاشق پر سرسری نگاہِ ناز ڈال کر چلا جاتا ہے مگر عاشق ہمیشہ کے لئے امیدوں کے لہلہاتے گلزاروں کی گلگشت اور مستقبل کے خواب دیکھنے کے شغلِ بیکاری میں محو ہو کر رہ جاتا ہے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں میں اُس کی یہ محویت مایوسی میں بدل جاتی ہے۔ امیدوں کے گلزار کا قور اور خوشیوں کے محل مسمار ہو جاتے ہیں ؎

تیرے آنے کی نہ تھی پھر بھی توقع ورنہ
جی تو لیتا میں تری زلف کے سر ہونے تک

بناؤ سنگار محبوبوں کا ایک پسندیدہ شغل ہے۔ اگر محبوب کو عاشق سے ملنے کا وعدہ پورا کرنے کے لئے جانا ہو تو وہ خاص توجہ سے بناؤ سنگار کرتا ہے۔ اِس میں قدرتی طور پر دیر لگ جاتی ہے۔ مرزا غالب کا شعر ہے ؎

آہ کو چاہئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

غالب کے نزدیک اتنی دیر برداشت کرنا اور زندہ رہنا عاشق کے لئے ناممکن ہے۔ وفا صاحب فرماتے ہیں کہ اتنی دیر صرف اس یقین کی صورت میں برداشت ہو سکتی ہے کہ محبوب آنے کا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔ لیکن اگر عاشق کو اس بات کا یقین ہی نہ ہو تو اُسے زندہ رہنے کی ضرورت کیا ہے ؎

کسی کے پاؤں پر سر رکھ دیا وفاؔ ہم نے
بڑا ہی عرض تمنا میں اختصار کیا

اظہارِ آرزو کا عام ذریعہ زبان ہے۔ لیکن عاشق کے لئے اس سے بھی موثر ذریعہ یہ ہے کہ زبان سے کچھ کہے بغیر محبوب کے قدموں پر سر رکھ دے۔ رعبِ حسن یا وفور

شوق کے باعث معشوق کے حضور میں عاشق کو بات کرنے کا حوصلہ نہیں پڑتا بات کرنے کی کوشش کرتا ہے تو زبان میں لکنت آجاتی ہے۔ آنکھیں بھی جب اظہارِ حال سے قاصر رہ جائیں تو عاشق کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ محبوب کے پاؤں پر سر رکھ دے۔ عاشق کی ساری کمزوریوں کی اس طرح تلافی ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں لفظ "اختصار" خاص طور پر قابلِ داد ہے اور وفا صاحب کے حسن طبع کی روشن دلیل ہے اس سے مختصر ذریعۂ اظہار کوئی تصور میں نہیں آسکتا ۔

اِدھر بڑھتے بڑھتے بڑھا دستِ شوق
اُدھر آتے آتے حجاب آگیا

یہ شعر حُسن وعشق کے باہمی تعلق کی ایک رنگین کیفیت کا حامل ہے شعر کے دونوں مصرعوں میں بڑا حسین توازن ہے جو شعر میں مست کر دینے والا ترنم پیدا کر رہا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ عاشق محبوب پر جوں جوں فریفتہ ہوتا جاتا ہے۔ توں توں محبوب اپنے آپ کو عاشق سے کھینچنے لگتا ہے۔ لیکن یہ کھچاؤ نفرت کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ بتدریج محبت میں ترقی کی علامت ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو اتنے سادہ اور مختصر الفاظ میں نظم کرنا وفا صاحب ہی کا حصہ ہے ۔

اے دوست اس گماں میں کہ تو نے کیا ہے یاد
ہچکی عدو کو آئی مرا دم نکل گیا

مرزا داغ کا شعر ہے ۔

مجھے یاد کرنے کا یہ مدعا تھا
نکل جائے دم ہچکیاں آتے آتے

وفا صاحب کا شعر چراغ سے چراغ جلانے کی غیر معمولی مہارت کا مظہر ہے
اور شدید جذبۂ رشک کے اچھوتے مضمون کا حامل ہے۔ جب کسی کو ہچکی آئے
تو پاس بیٹھا ہوا شخص فوراً کہہ اٹھتا ہے کہ تمہیں کسی نے یاد کیا ہے۔ رقیب
کو ہچکی آتی ہے تو عاشق کو گمان گزرتا ہے کہ رقیب کو محبوب نے یاد کیا ہے۔ یہ بات
عاشق پر گراں گذری اور اس کا دم نکل گیا۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ محبوب کو
رقیب کی یاد آنے پر عاشقِ صادق کا دم نکل جانا سولہ آنے قدرتی امر ہے۔

میں دمِ اخیر تک جس کا منتظر رہا
اب وہ میرے سوگ میں بن سنور کے آئے ہیں

یہ شعر بھی محبوب کے شغلِ آرائش پر مبنی ہے۔ عاشق کے آخری وقت پر
محبوب کا نہ پہنچ سکنا محبوب کی طبعی کوتاہی نہیں بلکہ بناؤ سنگار میں دیر
لگ جانے کا نتیجہ ہے۔ عاشق کے سوگ میں محبوب کا شامل ہو جانا اتنی
بڑی عزت افزائی ہے کہ عاشق اگلے جہان میں پہنچ کر بھی اس پر فخر کرے
گا۔ وفا صاحب کا شعر

کرو تکلیفِ شرکت کس لئے میرے جنازے میں
گھڑی بھر کو عزاداروں میں آبیٹھو تو کیا کم ہے

اسی فخر کے احساس کا حامل ہے

کبھی جو اس نے اجازت سوال کی دی ہے
جواب دے گئی ہے طاقتِ سوال مجھے

محبوب کی طرف سے سوال کی اجازت ملنا عاشق کے لئے اتنی بڑی خوشی کا
باعث ہوتا ہے کہ وہ خوشی میں سوال کرنا ہی بھول جاتا ہے۔ اور اسے
نہیں سوجھتا کہ کیا کہئے اور کیا نہ کہئے۔ طاقت سوال کا زائل ہو جانا اسی صورت

حال کا دوسرا نام ہے یہ شعر بدرجۂ غایت سہلِ ممتنع ہے۔ اور اتنے آسان اور سادہ الفاظ میں کہا گیا ہے کہ تشریح کا محتاج نہیں۔ پہلے مصرع میں "سوال" اور دوسرے مصرع میں لفظ "جواب" کا استعمال خاص طور پر قابلِ داد ہے۔

۵ مہربانی رحم کا ہے دوسرا نام اے وفاؔ
مہربانی پر محبت کا گماں کیا کیجیے

بے حد سلیس اور سادہ شعر ہے۔ اردو غزل میں محبوب کو عام طور پر ظالم اور عاشق کو مظلوم ظاہر کیا گیا ہے اور ظلم کو شانِ حسن اور ظلم سہنے کو شانِ عشق قرار دیا گیا ہے۔ لیکن کبھی کبھی محبوب عاشق پر کرم کرنے کے موڈ میں بھی آجاتا ہے۔ عاشق کو اس سے خوشی تو ہوتی ہے مگر اس خوشی پر اس خیال سے اوس پڑ جاتی ہے کہ محبوب کی مہربانی دراصل رحم کی ایک شکل ہے۔ اس خیال کے زیر اثر وہ یہ چاہتا ہے کہ محبوب اس سے محبت کرے۔ اتنے لمبے چوڑے مضمون کو اتنے مختصر الفاظ میں بیان کر دینا حسن و عشق کے معاملات میں وفاؔ صاحب کی باریک بینی نکتہ آفرینی اور نکتہ دانی کا منہ بولتا ثبوت ہے ؎

۶ دل جو گیا تو کیا ملال اس کی تلاش کیا ضرور
جس نے چرایا ہے اُسے وہ تو مری نظر میں ہے

محبوب کا نقش عاشق کی نظر ہی میں نہیں بلکہ دل و دماغ میں بھی ہر وقت سمایا رہتا ہے۔ چور چوری کے مال سمیت عاشق کے گھر ہی میں موجود ہوتا ہے۔ عاشق کے لئے اس سے زیادہ تسلی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ اور اُسے دل کی چوری کا غم کرنے اور اس کی تلاش میں بھٹکنے کی کیا ضرورت ہے۔ کتنا اچھوتا مضمون ہے۔ اور کتنی سلاست اور صفائی سے شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں "دل جو گیا تو کیا ملال" اور "اس کی تلاش کیا ضرور" دونوں

ٹکڑوں کے باہم توازن سے شعر میں جو موسیقی پیدا ہو گئی ہے وہ بیان و تشریح کی محتاج نہیں۔ ؎

منتخب میں ہی ہوا مشقِ تغافل کے لئے
وہ تغافل کیش میری یاد سے غافل نہیں

تغافل محبوب کے ظلم و ستم کی ایک مد ہے۔ اور عاشق کو تغافل کا تختۂ مشق بنانا اُس پر بہت بڑا ظلم کرنا ہے۔ لیکن عاشق اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دیتا ہے کہ ہم محبوب کی یاد میں تو ہیں۔ اس ظلم کی مشق کے لئے میرا چنا جانا کچھ کم فخر کی بات نہیں۔ کیونکہ میں ہر وقت اُس کی یاد میں آتا رہوں گا۔ لفظ "تغافل" سے ایسا آبدار مضمون پیدا کرنا وفا صاحب کے شاعرانہ کمال کی ایک اور دلیل ہے ؎

داد کے قابل تھا میرا ضبطِ الفت بزم میں
راز افشا تیری شرمیلی نگاہوں نے کیا

یہ شعر حُسن و عشق کے رموز و نکات پر وفا صاحب کی گہری نظر کا آئینہ دار ہے۔ رازِ الفت کو پوشیدہ رکھنا عاشق کے لئے بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔ اور اُس کے چہرے۔ اس کی آنکھوں اور حرکات سے خود بخود ظاہر ہوتا رہتا ہے۔ عاشق کے لئے بزمِ محبوب میں اسے ضبط کرنا اور بھی مشکل ہوتا ہے۔ شعر کے متکلّم نے جی پر جبر کر کے یہ معرکہ سر تو کر لیا مگر محبوب کی شرمیلی نگاہوں نے عاشق کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا۔ اور سرِ بزم سب راز آشکارا ہو گیا۔ کتنا وسیع مضمون ہے اور کتنے سادہ اور سلیس الفاظ میں ادا ہوا ہے۔ پہلے مصرع میں "داد کے قابل" کا ٹکڑا بجائے خود قابلِ داد ہے ؎

اندازۂ نشاطِ ملاقات کیجئے
خمیازۂ نشاط مگر کچھ نہ پوچھئے

نشاطِ ملاقات سے مُراد محبوب سے ملاقات کی خوشی ہے۔ لیکن ملاقات کے بعد جب محبوب رخصت ہو جاتا ہے تو عاشق پر ویسی اُداسی طاری ہو جاتی ہے جیسی شرابی پر شراب کا نشہ اُتر جانے کے بعد۔ یہ اُداسی کتنی سخت اور ناقابلِ بیان ہوتی ہے اُسے وفا صاحب نے غزل کی ردیف کے الفاظ "کچھ نہ پوچھیے" بلا بے حد صفائی اور زور کے ساتھ نمایاں کر دیا ہے۔ شعر کے پہلے مصرع میں "اندازۂ نشاط" اور دوسرے مصرع میں "خمیازۂ نشاط" غیر معمولی طور پر وجد آور ہیں اور اُن سے شعر کا مفہوم سوچنے سمجھنے کی تکلیف اُٹھائے بغیر بڑی آسانی سے سننے والے کے ذہن میں اُتر جاتا ہے۔ شعر کا قافیہ "مگر" اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ محبوب سے ملاقات کی خوشی جتنی دل نواز ہوتی ہے ملاقات کے بعد کی اُداسی اس سے کئی گنا زیادہ جاں گداز ہوتی ہے ؎

غمِ فراق شدید اس قدر نہ تھا پہلے
دُعا ہے اب نہ ملے راحت وصال مجھے

یہ شعر بھی وفا صاحب کے اس سے پہلے شعر کا ہم مضمون ہے۔ مگر اس فرق کے ساتھ کہ پہلے شعر میں نشاطِ ملاقات کی فراوانی اور ملاقات کے بعد کی اُداسی کی ایذا رسانی کی شدّت کے اظہار پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اور اس شعر میں غمِ فراق کی شدت سے بچنے کے لئے وصال کی خوشی حاصل کرنے کی آرزو سے توبہ کی گئی ہے۔ غمِ فراق کی شدّت کا اظہار کرنے کے لئے اس سے زیادہ موثر انداز شاذ و نادر ہی میسّر آ سکتا ہے ؎

کیا کیا سُنے ہیں آج سخن ہائے قہرناک
اُن سے مزاج پوچھئے پر کچھ نہ پوچھئے

مزاج پُرسی کے جواب میں خدا کا شکر ہے، کہنا ہمارے سماج کا عوامی معمول ہے۔ چنانچہ کسی پُرانے سخن ور کا شعر ہے ؎

اللہ رے دماغ کہ پوچھو اگر مزاج
کہتے نہیں کہ شکر ہے پروردگار کا

یہ شعر اس حقیقت پر مبنی ہے کہ محبوب احساس برتری کے زیر اثر عاشق کو بہت ہی کم حیثیت سمجھتا ہے۔ اور مزاج پُرسی کے جواب میں خدا کا شکر ہے، کہنا اپنی ہتک خیال کرتا ہے۔ یہ حقیقت شعر وفا کے پہلے مصرع سے اور بھی زیادہ اُجاگر ہو رہی ہے۔ اس مصرع سے ظاہر ہوتا ہے کہ وفا صاحب کے شعر کا محبوب بدرجہ غایت تُند خو بھی ہے۔ اور مزاج پُرسی کے جواب میں چپ اختیار کر لینا کافی نہیں سمجھتا بلکہ مزاج پُرسی کرنے والے پر بے تحاشا برس پڑتا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرع کی یہ خوبی خاص طور پر قابلِ داد ہے کہ اس میں ردیف اور قافیہ صحرا کے خود رو پھول کی طرح کسی تکلف کے بغیر خود بخود پیدا ہو گئے ہیں ؎

وہ دل بھی چُرا کے لے گیا ہے!
گزرا جو ابھی نظر چُرا کر!

اس حقیقت کی روشنی میں کہ عاشق سے محبوب کا نظر چُرانا حسن کی ایک ادا ہے۔ شعر کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عاشق کا دل محبوب نے ارادۃً نہیں چُرایا۔ نظر چرانے کی ادا پر خود بخود ہی فریفتہ ہو گیا ہے۔ اور عاشق کے ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ فارسی کے نامور عالی مقام شاعر بابا فغانی کا شعر ہے ؎

خوبی ہمیں کرشمۂ ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

بسیار کے معنی ہیں بے شمار۔ محبوب کا نظر چرانا ایسی ہی بے شمار اداؤں میں

سے ایک ہے۔ وفا صاحب کا سلیس اور فصیح و بلیغ اور سہل ممتنع شعر ہے

لیجئے نام کس کس ادا کا　　ہر ادا پر فنا ہو گئے ہم

بابا فغانی کے شعر کا حسین اور دلکش چربہ ہے ؎

مشکل نہ تھا مقابلہ تمکین یار کا

مشکل یہ ہے کہ دل ہی نہیں اختیار کا

تمکین رعبِ حسن ہی کی ایک شکل ہے۔ تمکین یار کا مقابلہ کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ اس کام کو انجام دینا دل کی ذمہ داری ہے۔ اس لئے اگر دل عاشق کے اختیار میں نہ ہو تو یہ کام اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس زمین میں حالی کا شعر ہے ؎

حائل ہے سنگ راہ میں تمکینِ یار کا

اب دیکھنا ہے زور دلِ بے قرار کا

بہت برجستہ اور قابلِ داد شعر ہے۔ ناظرین ذرا طبیعت پر زور دے کر اسے غور سے پڑھیں تو یقیناً لطف اندوز ہوں گے "مشکل نہ تھا" اور "مشکل یہ ہے" کتنے متوازن اور معنی خیز ٹکڑے ہیں ؎

کیا مر کے بھی اب جینے نہ دیں گے مجھے اعدا

کیوں آئے مری گور پہ با دیدۂ تر آپ

معشوق سے عاشق کی صدق دلی اور رقیبوں کی بے وفائی کے اشعار اردو غزل میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ بیوفائی کئی بری باتوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اور ان باتوں میں بدسلوکی بھی شامل ہے۔ رقیبوں کی بدسلوکی سے تنگ آکر محبوب کو عاشق کی صدق دلی یاد آنا اور مرحوم عاشق کی قدر پہچاننا قدرتی ہے۔ وہ دل کی بھڑاس نکالنے اور رنج و اندوہ کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے عاشق

کی قبر پر جا کر گریہ وزاری کرتا ہے - یہ گریہ وزاری قبر کے نیچے لیٹے ہوئے
عاشق پر گراں گزرتی ہے - اور وہ موت جیسی خاموشی کی زبان میں پکار
اٹھتا ہے کہ رقیب، اب بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑتے اور میری نیند حرام کر رہے
ہیں - شعر کا پہلا مصرع شعر کی جان ہے اور دوسرا مصرع شعر کی بنیاد،
اور لفظ 'کیا' سے پہلے مصرع کا آغاز اور لفظ 'کیوں' سے دوسرے مصرع
کا آغاز وفا صاحب کے حسنِ طبع کی دلیل ہے -

چوتھا باب

ایک تقابلی مُطالعہ

آتش

قریبِ حُسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ بُت سے برہمن بگڑا

نہیں بیوجہ ہنسنا اس قدر زخمِ شہیداں کا
تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ‌زن بگڑا

تکلف کیا جو کھوئی جان شیریں پھوڑ کر سر کو
جو غیرت تھی تو طے خسرو سے ہوتا کوہکن بگڑا

تری تقلید سے کبکِ دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اُس کا چلن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گُل کی طرح غنچہ جہاں اس کا دہن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مُو کم ہوا پیدا نہ اک تارِ کفن بگڑا

لگے منہ بھی چڑانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

وفا

چلی تفریق کی ایسی ہوا رنگِ چمن بگڑا
فضائے سبزہ بگڑی منظرِ سرو سمن بگڑا

گلوں پر شدتِ جورِ خزاں سے کیا بنی یارب
کہ اندازِ نوائے عندلیبِ نغمہ‌زن بگڑا

بنایا سب کو کچھ کا کچھ اس طرح اُس شوخِ پرفن نے
ہر اہلِ انجمن سے پھر ہر اہلِ انجمن بگڑا

بگڑنے کی وبا پھیلی ہے اک دل کے بگڑنے سے
جو دل بگڑا نظر بگڑی زباں بگڑی دہن بگڑا

بگاڑ ایسا نہ دیکھا تھا کبھی پہلے ان آنکھوں نے
دماغِ شیخ بگڑا اور مزاجِ برہمن بگڑا

نہ اب تادیب میں شفقت نہ شوخی میں ادب باقی
بزرگوں کی روش بگڑی عزیزوں کا چلن بگڑا

عذابِ جاں ہوئی ہیں بیڑیاں آخر غلامی کی
نظر آتا ہے اب کچھ اے وفا حالِ وطن بگڑا

مومنؔ

ڈر تو مجھے کس کا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
پر حال یہ افشا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
ناصح یہ گلہ کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
تو کب مری سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کب پاس پھٹکنے دوں رقیبوں کو تمہارے
پر پاس تمہارا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کیا کیا نہ کہے غیر اگر بات نہ پوچھو
یہ حوصلہ میرا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
چپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے
اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ حسن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

مومنؔ

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا
دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
مر گئے اس کے لب جاں بخش پر
ہم نے علاج آپ ہی اپنا کیا

وفاؔ

کہنا ہی مرا کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
یہ بھی نہیں ڈھوکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
رہتا ہے وہ بت شکوۂ اغیار پہ خاموش
کہتا ہے تو کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
یہ بات کہ کہنا ہے مجھے تم سے بہت کچھ
اس بات سے پیدا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ کہہ کے جو بن جاؤں برا سب کی نظر میں
اس سے یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
اپنی ہی کہے جاتا ہے اے ناصحِ نافہم
تو کچھ نہیں سنتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہلاؤں نہ کچھ غیر کی تعرلیف میں مجھ سے
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہنے کا تو اپنے ہے وفاؔ آپ بھی قائل
کہنے کو یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وفاؔ

اس سے کوئی بحث نہیں کیا کیا
جو بھی کیا آپ نے اچھا کیا
تجھ کو ترے حسن سے شہرت ملی
مجھ کو میرے عشق نے رسوا کیا

بُجھ گئی اک آہ میں شمعِ حیات
مجھ کو دمِ سرد نے ٹھنڈا کیا
زندگیِ ہجر بھی اک موت تھی
مرگ نے کیا کارِ مسیحا کیا
جَور کا شکوہ نہ کروں کیا ظلم ہے
راز مرا صبر نے افشا کیا
رحمِ فلک اور مرے حال پر
تُو نے کرم اے ستم آرا کیا
دشمنِ مومن ہی رہے بُت سدا
مجھ سے مرے نام نے یہ کیا کیا

کس سے ہوا ترکِ تمنا یہاں
کس نے یہاں ترکِ تمنا کیا
وعدہ ترا شام کو آنے کا تھا
راہ تری صبح سے دیکھا کیا
دشمنوں کو دشمنوں سے شکوہ کیوں
دوستوں نے دوستوں سے کیا کیا
مجھ کو جلاتی رہی غم کی جو آگ
آخر اُسی آگ نے ٹھنڈا کیا
میری گراں جانیوں نے اے وفا
پھر ملک الموت کو چلتا کیا

غالبؔ

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک
عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن
خاک ہو جائینگے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم
میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

وفا

صبر مشکل تھا محبت کا اثر ہونے تک
جان ٹھہری نہ دلِ دوست میں گھر ہونے تک
شب فرقت کی بھی ہونے کو سحر تو ہوگی
ہاں مگر ہم نہیں ہونے کے سحر ہونے تک
فرصتِ ماتمِ پروانہ کہاں سے آئے
شمع کو موت سے لڑنا ہے سحر ہونے تک
سہنے ہیں جور و ستم جھیلنے ہیں رنج و الم
یعنی کرتی ہے بسر عمر بسر ہونے تک
تیرا پردہ بھی اٹھا دے گی مری رسوائی
تیرا پردہ ہے مرے خاک بسر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اے وفاؔ معرکۂ عشق تو سر کیا ہوگا
ہو چکیں گے ہمیں یہ معرکہ سر ہونے تک

غالبؔ

درد منت کشِ دوا نہ ہوا
میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی
بندگی سے مرا بھلا نہ ہوا
جان دی دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا لہو نہ تھما
کام گر رُک گیا روا نہ ہوا
کچھ تو پڑھئے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

ذوقؔ

ہنگامہ گرم ہستیِ ناپائدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا
ہو رازِ دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

وفاؔ

دل کی تسکین کا آسرا نہ ہوا
ستم اُن کا کرم نما نہ ہوا
میرے نالوں سے ہل گئے افلاک
تیرے دل پر اثر ذرا نہ ہوا
زخم وہ کیا جو بھر گیا آخر
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا
تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا
تار ٹوٹا ترے تغافل کا
مٹ گیا میں تو کچھ بُرا نہ ہوا
دیر اُس نے بھی کی تو آنے میں
صبر تجھ سے بھی اے وفاؔ نہ ہوا

وفاؔ

پوچھیں وہ کاش حال دل بیقرار کا
ہم بھی کہیں کہ شکر ہے پروردگار کا
لازم اگر ہے شکر ہی پروردگار کا
پھر کیا علاج گردش لیل و نہار کا

پہنچے گا تیرے پاس کبوتر سے پیشتر
مکتوبِ شوق اُڑ کے ترے بیقرار کا
بُجھنے کی دل کی آگ نہیں زیرِ خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا
اُس روئے تابناک پہ ہر قطرۂ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبحِ بہار کا
اے ذوق گر ہے ہوش تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

صیاد بھی پہنچ گیا گلچیں بھی باغ میں
اے ہمصفیر آگیا موسم بہار کا
قانون کس نے بدلا ہے قدرت کا شیخ جی
دارو ہے اب بھی مے ہی غمِ روزگار کا
رکھے گا بے قرار تمہیں بھی تمام عمر
مرنا تڑپ تڑپ کے کسی بے قرار کا
بے لوث ہو ہوس سے اگر عشق اے وفا
ہے ذکرِ یار میں بھی مزا وصلِ یار کا

ذوق

مرتے ہیں ترے پیار سے ہم اور زیادہ
تو لطف میں کرتا ہے ستم اور زیادہ
وہ دل کو چرا کر جو لگے آنکھ چرانے
یاروں کا گیا اُن پہ بھرم اور زیادہ
جو پیٹ کے ہلکے ہیں پچے بات کب اُن سے
روکیں تو اپھر جائے شکم اور زیادہ
کیوں میں نے کہا تجھ سا خدائی میں نہیں اور
مغرور ہوا اب وہ صنم اور زیادہ
لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ
جو کنج قناعت میں ہیں تقدیر پہ شاکر
ہے ذوق برابر نہیں کم اور زیادہ

وفا

کھاتے ہیں وہ غیروں کی قسم اور زیادہ
مجبور ہوئے جاتے ہیں ہم اور زیادہ
بس اے فلکِ پیر کہ باقی نہیں مجھ میں
اب طاقتِ برداشتِ غم اور زیادہ
جب چلنے سے معذور ہوا ناقۂ لیلیٰ
اٹھنے لگا مجنوں کا قدم اور زیادہ
جو صورتِ جادہ کبھی اُف تک نہیں کرتے
ہوتے ہیں وہ پامالِ ستم اور زیادہ
وہ سامنے ہیں گنجِ شہیداں کے نظارے
ہاں چلئے ذرا چار قدم اور زیادہ
دیتا ہوں وفا اُس ستم آرا کو دعائیں
اللہ کرے حسنِ ستم اور زیادہ

داغ

کب سے شبِ فراق ہوں مشتاق دید کا
خورشید ہو گیا ہے مجھے چاند عید کا

کیا قتل حسرتیں ہوئیں دل ہیں کہ بے کسی
لے لے کے نام روتی ہے اک اک شہید کا

چھوٹا ہے قفلِ میکدہ اے میکشو نوید
رہنے دو محتسب کو محافظ کلید کا

وہ بت کرے خدائی کی باتیں خدا کی شان
جو حرف پڑھ سکے نہ کلامِ مجید کا

پھر سہو ہو گئیں تری وعدہ خلافیاں
پھر اعتبار ہے مجھے عہدِ جدید کا

اے شیخ فیضِ پیرِ خرابات دیکھنا
جو حال پیر کا ہے وہی ہے مرید کا

حورانِ خلد بولتے ہیں بڑھ کے بولیاں
نیلام ہو رہا ہے تمہارے شہید کا

رکھنا وہ روک روک کے لڑتی نگاہ کو
رہنا وہ تھام تھام کے دل محوِ دید کا

اے داغ کیوں نہ مجھ کو شفاعت کی ہو اُمید
میں ہوں محبِ حسین کا دشمن یزید کا

وفا

ارمان مدتوں میں نکلتا ہے دید کا
دلدار بن کے ہو گئے تم چاند عید کا

حوروں کا اژدہام ہے حدِ نگاہ تک
فردوس کو جلوس چلا ہے شہید کا

ہو آتے ساتھ آپ بھی دو چار دس قدم
لے جا رہے ہیں لوگ جنازہ شہید کا

ٹھوکر کو اتفاق نہ گردانئے حضور
رک جائیے مزار یہی ہے شہید کا

اشرار دوستی میں ہے اشراف دشمنی
قاتل حسین کا ہے معاون یزید کا

قدریں مٹائی جاتی ہیں عہدِ قدیم کی
آئین بن رہا ہے نظامِ جدید کا

آموزگارِ کفر ہو جب پیر کا چلن
ایمان کیا رہے گا سلامت مرید کا

ہوتی تھی جب بسر تری صحبت میں رات دن
ہر رات تھی برات کی ہر دن تھا عید کا

دھونے پڑیں گے جان سے ہاتھ اے وفا ہمیں
ہوگا یہی مآل تمنائے دید کا

داغ

جب وہ بت ہم کلام ہوتا ہے
دل و دیں کا پیام ہوتا ہے
اُن سے ہوتا ہے سامنا جس دن
دُور ہی سے سلام ہوتا ہے
دِل کو روکوں کہ چشم گریاں کو
ایک ہی خوب کام ہوتا ہے
آپ ہیں اور مجمع اغیار
روز دربارِ عام ہوتا ہے
زیست سے تنگ ہیں بچھڑ ہمیں
دیکھ غصّہ حرام ہوتا ہے
لیجے موسیٰؑ سے لن ترانی کی
اب تو ہم سے کلام ہوتا ہے
داغ کا نام سُن کے وہ بولے
آدمی کا یہ نام ہوتا ہے

وفا

صبح ہوتا ہے شام ہوتا ہے
خونِ ناحق مدام ہوتا ہے
پھیر لیتے ہو منہ حقارت سے
یہ جواب سلام ہوتا ہے
کہتے ہو آپ کا یہاں کیا کام
عرضِ غم بھی تو کام ہوتا ہے
خوف آتا ہے جن کو مرنے سے
اُن کا جینا حرام ہوتا ہے
جینے والے بھی مر ہی جاتے ہیں
مرنے والوں کا نام ہوتا ہے
کیا کلام اس کی خوش نصیبی میں
جس سے تُو ہم کلام ہوتا ہے
آمد آمد ہے اے وفا کس کی
آج کیا اہتمام ہوتا ہے

داغ

ہوا جو ان کی خموشی کا کچھ ملال مجھے
جواب دینے لگی طاقتِ سوال مجھے
غم عدو میں نہ گھبراؤ ہے یہ دورِ فلک
کبھی ملال تمہیں ہو کبھی ملال مجھے

وفا

نہیں ثباتِ جہاں میں اب اعتمال مجھے
رقیب دے رہے ہیں مژدۂ وصال مجھے
ترے وصال میں مرنا بھی کچھ محال نہ تھا
ترے فراق میں جینا بھی ہے وبال مجھے

صدائے نالۂ شبِ وصل بھی نہ دل سے گئی
پکارتی تھی یہ حسرت مری نکال مجھے

خبر نہیں کفِ نازک کا رنگ کیا ہوگا
خرامِ ناز سے ہوتا ہے پائمال مجھے

پلادے بزم میں ساقی اُسے شراب اتنی
وہ مستِ ناز کہے مجھ سے تو سنبھال مجھے

شکایتوں سے محبت کی اور کیا حاصل
کچھ انفعال تمہیں ہو کچھ انفعال مجھے

اسیرِ حلقۂ کاکل نہیں ہوا اے داغ
مرے خدا نے بچایا ہے بال بال مجھے

غمِ فراق شدید اس قدر نہ تھا پہلے
دُعا ہے اب نہ ملے راحتِ وصال مجھے

اگر عدو سے تجھے واقعی محبت ہے
تو امتحان میں لے بدگمان ڈال مجھے

تری خوشی ہو عدو کی خوشی کے تابع کیوں
تری خوشی کا بھی ہونے لگا ملال مجھے

کبھی جو اُس نے اجازت سوال کی دی ہے
جواب دے گئی ہے طاقتِ سوال مجھے

میں ناز کیوں نہ کروں اپنی بے کمالی پر
کہ اے وفا نہیں اندیشۂ زوال مجھے

داغ

کیا ہو سکے مقابلہ مژگانِ یار کا
دل ایک ہاتھ کا ہے جگر ایک وار کا

پوچھے کوئی مزاج تو اللہ رے غرور
کہتے نہیں وہ شکر ہے پروردگار کا

رہتی تھی اس کی یاد وہ راتیں گذر گئیں
اب مجھ کو انتظار ہے اُس انتظار کا

توبہ جو میں نے کی نکل آیا ذرا سا منہ
وہ رنگ روپ ہی نہیں صبحِ بہار کا

وفا

مشکل نہ تھا مقابلہ تمکینِ یار کا
مشکل یہ ہے کہ دل ہی نہیں اختیار کا

تازہ جگر کے داغ ہوئے ہجرِ یار میں
نکھرا خزاں میں رنگ ہماری بہار کا

کیا جانے آ کے جائے نہ جائے خزاں کا دور
اور جا کے موسم آئے نہ آئے بہار کا

آنکھوں پہ ہے یقین نہ کانوں پہ اعتبار
وہ حال پوچھتے ہیں دلِ بے قرار کا

میں بدگماں اس سے زیادہ خدا کی شان
ہے اعتبار اس کو مرے اعتبار کا

اٹھنا ہی تیری بزم سے دشوار تھا مجھے
اس پر سنبھالنا دلِ بے اختیار کا

ٹکڑے کروں زبانِ شکایت کے تو سہی
کیا حال ہے کسی نگہِ شرمسار کا

اے چشمِ یار دیکھ تغافل سے باز آ
دل ٹوٹ جائے گا کسی امیدوار کا

غش کھا کے داغِ یار کے قدموں پہ گر پڑا
بے ہوش نے بھی کام کیا ہوشیار کا

اپنے ہی دل پہ جبر کئے جا رہا ہوں میں
بس یہ ہے طول و عرض مرے اختیار کا

دل کا بھی خوں بہا نہ ملا جان بھی گئی
احسان بھی رہا نگہِ شرمسار کا

آخر حریفِ عشق بنا ہر شریکِ غم
سچ ہے کہ اب زمانہ نہیں اعتبار کا

نفرت سے عرضِ شوق پہ منہ پھیرتے نہیں
دل توڑتے نہیں کسی امیدوار کا

روداد یہ ہے مختصراً اے وفا مری
مارا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا

پانچواں باب

نظم نگاری

ایک وقت ایسا تھا جب اردو شاعری میں نظم کا مفہوم صرف قصیدہ یا مثنوی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن یہ دونوں اصنافِ سخن بھی زیادہ مقبول نہ تھے اور نہ ہی کوئی عزت کا مقام حاصل کر سکے۔ پھر نظم کے تحت انیس اور دبیر نے مرثیہ نگاری کو چار چاند لگائے اور اپنے زورِ قلم سے اس صنف کو عروجِ کمال تک پہنچا دیا۔ طرزِ بیان۔ مشاہدات۔ حسنِ زبان اور شدتِ احساس اس خوبی سے ایک جا جمع ہوئے کہ اس سے آگے بڑھنا آیندہ نسل کے لئے ناممکن ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے سررشتہ تعلیم پنجاب کے ڈائریکٹر کرنل ہالرائیڈ کی سرپرستی میں اُردو شعر و سخن کو ایک نئی ڈگر پر ڈالنے کے لئے لاہور میں ایک انجمن قائم کی جس کے مشاعروں میں مصرع طرح کی بجائے نظم کا عنوان مضمون دیا جاتا تھا اور اس طرح متنوع موضوعات پر مربوط نظمیں لکھی جانے لگیں۔ چنانچہ یہ وہ زمانہ تھا جس میں "نظم جدید" کی بنیاد پڑی اور لفظ نظم کا ایک نیا مفہوم سامنے آیا۔ نظم جدید کے اس دور میں حالی کے حُبِ وطن۔ برکھا رُت۔ نشاطِ اُمید۔ مناظرہ رحم و انصاف۔ مدو جزر اسلام المعروف بہ مسدس حالی بہت مقبول ہوئیں اور اسی طرح آزاد کی متعدد نظمیں مثلاً شبِ قدر۔ صبحِ اُمید۔ گنجِ قناعت۔ دادِ انصاف۔ خوابِ امن وغیرہ اسی زمانے میں

تصنیف ہوئیں۔ حتیٰ کہ نظم نگاری کو بے حد فروغ حاصل ہوا۔ ان نظموں
کی تازگی۔ طرفگی اور بے ساختگی دیکھ کر چند روشن خیال شعرا آزاد اور
حالی کی نرالی روش پر چلنے لگے۔ اس دورِ جدید کے علم برداران میں اسمٰعیل
میرٹھی۔ شوق قدوائی۔ سرور جہاں آبادی۔ نادر کاکوروی۔ برق دہلوی
اقبال۔ محروم۔ چکبست۔ رواں۔ سورج نراین مہر۔ برجموہن کیفی۔
منشی محمد ناظر۔ غلام بھیک نیرنگ۔ ظفر علی خاں وغیرہ وغیرہ تھے۔

اس دورِ جدید میں مغربی اثر کے ماتحت سائنس اور فلسفہ کے
مطالعہ سے اُردو شاعری بہت متاثر ہوئی۔ اس لئے اصلیت اور واقعہ
نگاری شعرا کے کلام میں روز بروز زیادہ ہوتی گئی۔ بے کیف مبالغہ اور
تصنع شاعری سے کم ہوتا گیا۔ صداقت اور اصلیت منظر نگاری اور واقعہ
نگاری کے علاوہ جذبات وواردات کے اظہار میں بھی مدِ نظر رہی۔ موضوعات
شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ مسلسل اور مستقل نظموں کا ایک قابلِ
قدر ذخیرہ ہمارے ادب میں نظر آنے لگا۔ جتنا ذخیرہ مسلسل نظموں کا
گزشتہ پچاس برس میں تیار ہوا اتنا اردو شاعری کی ساری عمر میں بھی نہ
ہوا ہوگا۔ اس دور کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی تھی کہ مناظر قدرت کی
تصویر کشی کے علاوہ سیاسی۔ حب الوطنی۔ ملکی۔ ملی اور قومی شاعری نے بھی
اُردو نظم کے خزانے کو مالامال کر دیا۔

چنانچہ اس ادبی اور شاعرانہ پس منظر میں وفا صاحب ۱۹۱۳ء میں
مرے کالج مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کر کے لاہور چلے گئے۔
۱۹۱۳ء سے ۱۹۲۳ء تک آپ مختلف روزانہ اخبارات میں مترجم اور سب
ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ اس دوران میں کچھ عرصہ تک مقتدر

ماہنامہ مخزن کی ایڈیٹری کے فرائض بھی سرانجام دیئے۔ بالآخر ۱۹۲۳ء میں شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے کے روزنامہ بندے ماترم کے ایڈیٹر مقرر ہوئے اس کے بعد وقتاً فوقتاً لاہور کے کئی اور اُردو روزناموں کی ایڈیٹری کی ان میں خاص طور پر قابلِ ذکر بھیشم اور ویر بھارت تھے۔ یہ دونوں اخبارات پنڈت مدن موہن مالویہ کی سرپرستی میں جاری ہوئے۔ لاہور اُس زمانے میں صوبہ پنجاب کا دارالحکومت ہونے کے باعث ثقافتی۔ ادبی اور تعلیمی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ وفا صاحب ۱۹۱۳ء سے ۱۹۴۷ء تک زیادہ تر لاہور ہی میں مقیم رہے اور اپنی صحافتی اور شاعرانہ صلاحیتوں سے حلقہ معاصرین میں ایک ممتاز و مقتدر مقام پر پہنچ گئے۔ اس وقت ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری روز بروز بڑھ رہی تھی اور ہندوستانی عوام بدیشی حکومت کو ملک سے نکالنے کے لئے بے تاب تھے۔ آل انڈیا نیشنل کانگرس آزادی کی اس جنگ میں ملک کی واحد راہ نما اور ترجمان سمجھی جاتی تھی۔ ہر طرف انقلاب زندہ باد کے فلک شگاف نعرے سنائی دیتے تھے۔

یہ زمانہ سیاسی خلفشار۔ سماجی اضطراب اور طبقاتی کشمکش کا زمانہ تھا۔ کانگرس دستوری مراعات کے مطالبات کی سرحدوں سے نکل کر سوراجیہ کی مانگ کرنے لگی تھی۔ اور کانگرس کی مانگوں سے سامراجی حکومت کو بغاوت کی بو آتی تھی۔ اس لئے وہ اس سیاسی بیداری اور آزادی کے بڑھتے ہوئے شعور کو کچل دینا چاہتی تھی۔ چنانچہ اس دوران میں انگریز حکومت کی طرف سے ظلم و تشدد کے کئی ایک دلخراش سانحے ظہور میں آئے۔ الغرض ان حالات میں وفا صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز وطن کی آزادی اور خوشحالی کے ارمانوں سے ہوا۔ اور یہی ارمان اُن کے شعری وجدان کے لئے تحریک کا کام کرتے تھے۔

ان ہی رُجحانات کے سائے میں اُن کے جذبات واحساسات اور فکر ونظم کی پرورش ہوئی اور انہی سے ان کی زندگی کے سماجی، سیاسی عقائد وخیالات اور تخلیقات وغیرہ متاثر ہوئے اور یہی وجہ ہے کہ وفا صاحب کی نظموں کا ایک بڑا حصہ ملک وقوم کی محبت اور عظمت کے نغمات سے عبارت ہے۔

وفا صاحب کی ایک دو نظموں کے چند اشعار درج ذیل ہیں جن سے ناظرین یہ اندازہ کر سکیں گے کہ عوام کو غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بھڑکانے اور اپنے ہم وطنوں کے جذباتِ غیرت وحمیت ابھارنے میں ان کی آتش بیانی کا حصہ کتنا بڑا اور کس قدر اہم تھا۔ ان کی ایک نظم کا عنوان ہے "کتے کی فریاد" اس نظم کے پہلے تین چار شعروں میں یہ بتانے کی بعد کہ کسی شخص نے کتے کو بڑے زور سے لاٹھی ماری اور کتا چوٹ کی شدت سے بیتاب ہو کر دردناک آواز میں چلانے لگا۔ آخر کے دو شعروں میں کتے کی زبان سے اس شخص کو یوں مخاطب کیا گیا ہے ؎

مزا تجھ کو بھی آجاتا ابھی کتا اگر میں بھی ۔۔۔ کسی مغرور خود سر بد مزاج انگریز کا ہوتا
ابھی دو گولیاں تیرے جگر کے پار ہو جاتیں ۔۔۔ ابھی تو سامنے میرے تڑپتا لوٹتا ہوتا

اسی نوعیت کی ایک اور مشہور نظم "چوری کی تفتیش" ہے۔ اس نظم کا پلاٹ یہ ہے کہ ایک دیہاتی کے گھر میں چوری ہو گئی اور چور کھانے پینے کے برتن چھوڑ کر گھر کا سارا اثاثہ چرا لے گئے۔ وہ دیہاتی ان برتنوں کو اٹھا کر تھانے میں لے گیا اور ؎

زمیں پر سارے برتن ڈال کر یہ عرض کی اس نے ۔۔۔ رقم کر لیجئے صاحب انہیں پہلے ہی خانے میں
اس پر محرر تھانے نے

کہا مطلب ہے کیا اس کا ارے احمق تو وہ بولا ۔۔۔ انہیں کھا جائیں گے پولیس والے آنے جانے میں
نہ کرتا ذکر بھی تھانے کا لیکن مجھ کو یہ ڈر تھا ۔۔۔ مبادا آپ دھر لیں واردتوں کے چھپانے میں

غلام قوم کو ایسے شاعروں اور دانشوروں کی ضرورت ہوتی ہے جو اُسے حُب الوطنی و قوم پرستی ۔ ایثار و عمل ۔ اتحاد و یگانگت اور جد و جہد کا درس دیں۔ قوم کے افراد میں اتفاق اور تحریک عمل پیدا کریں۔ آزادی اور انقلاب کے جذبات بیدار کریں۔ یہاں قوم پرستی ۔ حب الوطنی اور آزادی و انقلاب کے نعروں کا مطلب غیر ملکی استبداد اور سامراج کی چیرہ دستیوں کو ختم کرنا ہوتا ہے کسی غلام قوم کی حب الوطنی اور قوم پرستی میں اگر تشدد کے جذبات بھی پیدا ہو جائیں تو ان کا دائرۂ اثر سامراجی غاصبوں تک محدود رہتا ہے۔ اس سے امن عالم میں خلل واقع نہیں ہوتا۔ وفا صاحب کی کچھ نظموں میں مندرجہ ذیل اشعار ان جذبات کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔ اپنے ہم وطنوں کو کتنی بے باکی اور بے خوفی سے عزم و عمل کی تلقین کرتے ہیں ؎

اگر اے ہند یو کچھ بھی تمہارے دل میں غیرت ہے
اٹھو اور کاٹ ڈالو مادرِ بھارت کی زنجیریں
تمہارے ساتھ حق ہے اور حق میں اتنی طاقت ہے
کہ جس سے کند ہو جاتی ہیں سفاکوں کی شمشیریں

خوابِ غفلت سے اٹھو اے ہندیو بیدار ہو
کیوں پڑے ہو اس طرح بیکار گرمِ کار ہو
جنگِ آزادی کا بجتا ہے بگل ہشیار ہو
زندہ رہنا ہے تو مرنے کے لئے تیار ہو
ہاں کفن بر سر شریکِ لشکرِ احرار ہو

غم نہ کر کچھ اس کا دشمن ہے اگر خنجر بکف
راستی کی راہ سے تجھ کو ہٹانے کے لئے
ہر دم اپنے سامنے رکھو ان شہیدوں کی مثال
زندگی جن کی سبق ہے اک زمانے کے لئے
موت سے کیوں اتنی دہشت جان کیوں اتنی عزیز
موت آنے کے لئے ہے جان جانے کے لئے

تو ہمیں مجبور ہی کر دے تو یہ ہے اور بات
خون دینے میں تامل آج اگر ہم کو نہیں

ورنہ دشمن کو کبھی پہنچاتے نہیں آزار ہم
خون لینے کو کبھی ہو جائیں گے کل تیار ہم

آج سے کوئی پچاس برس پہلے وفا صاحب نے ایک چھوٹی سی نظم "آج کا باغی کل کا حکمران" کے عنوان سے لکھی اور اس باغیانہ نظم کی اشاعت جو نتیجہ ہوا ہوگا آپ بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں۔ نظم ملاحظہ ہو ؎

سنبھال اب اے فرنگی ہو رہا بستر سنبھال اپنا
وہ دن نزدیک ہے آزاد جب ہندوستاں ہوگا

تشدد پر نہ تکیہ اے تشدد کیش کر اتنا
تشدد میں مآلِ کار تیرا بھی زیاں ہوگا

تشدد پر اُتر آئیں گے اہلِ ہند مجبوراً
تشدد کا جواب آخر تشدد بے گماں ہوگا

تو ہو گا اُن کے نیچے اور وہ ہوں گے تیرے اوپر وہ
یقیناً ایک دن یہ انقلاب آسماں ہوگا

رہی صدیوں سے محروم بہار اب تک خزاں جس کی
یہ گلشن پھر ہم آغوشِ بہارِ بے خزاں ہوگا

حماقت ہے سراسر جرم ٹھہرانا بغاوت کو
کہ باغی آج کا ہے جو وہ کل کا حکمراں ہوگا

ذیل کی نظم "اے فرنگی" کے مطالعہ سے آپ بخوبی جان جائیں گے کہ یہ نظم کتنی جوشیلی ہے اور بدیشی حکومت کو کس طرح آڑے ہاتھوں لیا گیا ہے۔ شاعرِ حریت کو اس نظم کی اشاعت پر دو سال کی قید و بند کی سزا ملی ؎

اے فرنگی کبھی سوچا ہے یہ دل میں تو نے
اور یہ سوچ کے کچھ تجھ کو حیا بھی آئی

نامبارک تھا بہت ہند میں آنا تیرا
قحط آیا ترے ہمراہ وبا بھی آئی

تیرے قدموں سے لگی آئی غلامی ظالم
ساتھ ہی اس کے غریبی کی بلا بھی آئی

بن گئی بادِ سموم آہ! اثر سے تیرے
اس چمن میں جو کبھی بادِ صبا بھی آئی

تیری کلچر میں چمک ہے مگر اس میں نظر
کبھی کچھ روشنی صدق و صفا بھی آئی

یہی کلچر سببِ پستیٔ اخلاق ہوئی
ہندیوں میں اسی کلچر سے ریا بھی آئی

جائے شکر اس میں شکایت تری بیداد کی تھی — غم نصیبوں کو اگر یادِ خدا بھی آئی
تیری سنگینیں چمکنے لگیں سڑکوں پہ جونہی — لب پہ مظلوموں کے فریاد ذرا بھی آئی
دردِ افلاس کا نیزوں سے کیا تو نے علاج — موت بنکر ترے ہاتھوں میں شفا بھی آئی
اس روش پر کبھی اے بانیٔ بیداد تجھے — دل کے اندر سے ملامت کی صدا بھی آئی

سنہ ۱۹۳۹ء کی دوسری سہ ماہی میں سردار بھگت سنگھ مسٹر دت اور بہت سے دوسرے نوجوانوں کو باغیانہ سازش کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا۔ دورانِ مقدمہ میں انہوں نے جیل کے اندر اس مطالبہ کی بنا پر بھوک ہڑتال کر دی کہ یوروپین اور ہندوستانی قیدیوں کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جائے۔ وفا صاحب نے بھوک ہڑتال کی وجہ کے عنوان سے اپنے تاثرات قلمبند کئے جو حسبِ ذیل ہیں:

تیرے نیاز مند ہیں اے مادرِ وطن — کرتے ہیں تیری شانِ تقدس پہ ناز ہم
جو تیرے خیر خواہ نہیں اُن کے سامنے — رگڑیں گے بھول کر نہ جبینِ نیاز ہم
کس طرح سر جھکائیں کہ حکام سے نہیں — زنہار طالبِ نگہِ دل نواز ہم
ہر چند جیل خانے میں ہیں ایک ماہ سے — فاقوں سے وقفِ کشمکشِ جاں گداز ہم
ہندی پہ ناگوار ہے گورے کی فوقیت — پاتے نہیں دلیل سے جس کا جواز ہم
اب جی میں ٹھان لی ہے کہ دیدینگے اپنی جان — یا دور کر کے چھوڑیں گے یہ امتیاز ہم

شہیدِ اعظم بھگت سنگھ اور ساتھیوں کی بھوک ہڑتال کو سیشن جج مسٹر سٹیپ نے اقدامِ خود کشی سے تعبیر کیا۔ اس فیصلے پر وفا صاحب یوں رائے زن ہیں ؎

اب دی گئی ہے فاقہ کشی بھی قرارِ جرم — کہتے ہیں ایک دوست سے منشی نہال چند
بے شبہ ہے عجیب سیشن جج کا فیصلہ — احمد علی ہے متفق اس سے نہ لال چند
تصویر بن گئے ہیں تعجب کی سربسر — قانون پیشہ ہیں جو یہاں باکمال چند
کردیں جناب سٹیپ پر یہ کاش آشکار — ہمارے خدا کے ہیں جو صحیح الخیال چند
ہر سمت ہند میں نظر آئیں گے فاقہ کش — انگریز رہ گئے جو یہاں اور سال چند

"کوئٹ انڈیا" کا جو نعرہ کانگرس نے ۱۹۴۲ء میں بلند کیا وفا صاحب نے وہ نعرہ ہندوستان چھوڑو کے عنوان سے ۱۹۳۸ء میں ایک دلاویز مدلل اور زوردار نظم کی صورت میں سپرد قلم کیا۔ نظم کے آخری پانچ مصرعوں میں جو استدلال پیش کیا گیا ہے وہ اتنا صاف۔ سادہ اور مسکت ہے کہ اس سے بہتر تصور نہیں کیا جا سکتا ہے

سارے جہاں سے پیارا ہندوستاں ہمارا — دل کش ہے اور دلآرا ہندوستاں ہمارا
سرسبز برکتوں سے نفاداب وادیوں سے — جنت نشاں ہے سارا ہندوستاں ہمارا
سب سے جو خوشنما ہے وہ ملک کون سا ہے — سب پر آشکارا ہندوستاں ہمارا
مرنے کو اسکی خاطر تیار رہیں نہ کیوں ہم — جینے کا ہے سہارا ہندوستاں ہمارا
ہرگز نہ ہم جہاں میں اتنے ذلیل ہوتے — ہوتا اگر ہمارا ہندوستاں ہمارا
اس سلطنت سے جس میں عزت نہیں ہماری — کر لے کہیں کنارا ہندوستاں ہمارا
بسمل ہے نیم جاں ہے بے بس ہے بے زباں ہے — جور و ستم کا مارا ہندوستاں ہمارا
برطانیہ سے کہدو اب غیر کی غلامی — کرتا نہیں گوارا ہندوستاں ہمارا
برطانیہ کے تم ہو ہندوستاں کے ہم ہیں — برطانیہ تمہارا ہندوستاں ہمارا
برطانیہ تمہارا ہندوستاں ہمارا — چھوڑو بس اب خدارا ہندوستاں ہمارا
ہندوستاں ہمارا ہندوستاں ہمارا

کانگرس کے عظیم الشان سیاسی کردار کی توصیف کرتے ہوئے وفا صاحب یوں رقم طراز ہیں ؎

ہندوالوں کے دلوں کی ترجماں ہے کانگرس — ان کروڑوں بے زبانوں کی زباں ہے کانگرس
روز و شب اک گرمجوشی اور یکسوئی کے ساتھ — منزل مقصود کی جانب رواں ہے کانگرس
ملک و ملت کی امیدوں کا اسی پر ہے مدار — اس سبب سے مرجع پیر و جواں ہے کانگرس

ہے یہاں مفقود شیخ و برہمن کا امتیاز
بے نیازِ رنجشِ ناقوس و اذاں ہے کانگرس
ہر طرف جاری ہے تحریکِ قیامِ حریت
اور اس تحریک کی روحِ رواں ہے کانگرس
اے وفاؔ میں کیوں نہ ہوں اس کا غلامِ زرخرید
ضامنِ آزادیٔ ہندوستاں ہے کانگرس

وفاؔ صاحب نے مادرِ وطن کی عظمت کے گیت اس طرح محبت میں سرشار ہو کر لکھے ہیں کہ آپ کی حب الوطنی اور دیش بھگتی سچے پوجاری کی پوجا کے درجے کی چیز بن کر سامنے آتی ہے۔ اُن کی شخصیت کے بے پناہ خلوص اور عقیدے کی طہارت نے ان کے دیش پیار میں عبادت کی شان پیدا کر دی ہے "عظمتِ وطن" کے ایک ہی عنوان سے آپ نے قریباً پچاس ساٹھ سال کے وقفے میں دو حسین و جمیل نظمیں کہی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان دونوں نظموں سے ناظرین کی ضیافتِ طبع کی جائے کیونکہ ان نظموں میں سے کسی ایک کو چھوڑ دینا جہاں ناظرین پر ظلم ہوگا وہاں وفاؔ صاحب سے بھی بے انصافی ہوگی ؎

وہ رنگینی ہے اے باغِ وطن تیری بہاروں میں
نظر آتی نہیں روئے زمیں کے لالہ زاروں میں
ازل سے ہے لقب گہوارۂ شائستگی تیرا
رہی ہے کھیلتی تہذیب تیرے مرغزاروں میں
وہ نغمے ہیں ترے آن پڑھ کسانوں کی زبانوں پر
جو خوابیدہ ہیں سازِ منطقِ مغرب کے تاروں میں
ہر اک ذرہ ترا معمورۂ نورِ تقدس ہے
کہاں وہ مہر عالمتاب میں تیرے غباروں میں
ترے گردوں کی شانِ دلفریبی اور ہی کچھ ہے
وگرنہ روشنی موجود ہے ہر جا ستاروں میں

رشکِ ایران و مصر و یمن اے وطن
غیرتِ روم و شام و عدن اے وطن
دلکش و دلکشا ہیں فضائیں تیری
اور تو ہے سراپا چمن اے وطن
دلنشیں تر گلستانِ جنت سے ہیں
تیری آبادیاں تیرے بن اے وطن

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

آفتابِ تمدن کی پہلی کرن | تیرے رُخ پر ہوئی ضَو فگن اے وطن
ہر زمانے میں دنیا کو تو نے دیئے | ماہرِ علم، یکتائے فن اے وطن
شہرہ دُنیا میں جن کی شجاعت کا ہے | اُن شجاعوں کا ہے تو وطن اے وطن

اے وطن اے وطن اے وطن
اے وطن اے وطن اے وطن

جان و دل سے ہیں تیرے پرستار سب | طفل و پیر و جواں مرد و زن اے وطن
تیری خدمت کی رکھتا ہے دل میں لگن | شیخ ہے کوئی یا برہمن اے وطن
تیری بہبود ہے سب کو مدِّ نظر | تجھ سے پیارا ہے تن من نہ دھن اے وطن

اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

پنجاب عرصۂ قدیم سے ایک امتیازی شان کا حامل رہا ہے۔ شمالی مغرب کی جانب سے جتنے غیر ملکی حملہ آور ہندوستان میں وارد ہوئے پنجاب نے انکی سخت مزاحمت کی۔ پنجاب کی سرزمین میدانِ جنگ بنی اور یہاں کئی مشہور تاریخی لڑائیاں لڑی گئیں۔ یہاں کے باشندے بہادر، جفاکش، محنتی تنومند، ملنسار اور متواضع واقع ہوئے ہیں۔ تقسیم وطن کے بعد پنجابی کسان نے اپنی ہمت اور محنت سے زرعی پیداوار کا ایک ریکارڈ قایم کردیا ہے۔ خود کفیل ہونے کے علاوہ پنجاب دیگر حاجتمند پڑوسی ریاستوں کی ضروریات غلّہ پوری کر رہا ہے۔ چنانچہ سرزمین پنجاب کی شان میں وفا صاحب نے ایک سرتاپا مرصّع نظم تحریر فرمائی ہے۔ نظم میں غزل کی چاشنی دے کر تاثر میں بے حد اضافہ کر دیا ہے۔ فنی اعتبار سے یہ نظم اردو شاعری کا ایک شاہکار کہلانے

کی مستحق ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر ہر پنجابی فخر سے سر اونچا کر سکتا ہے۔

واہ وا کیا پُر فضا ہے سرزمیں پنجاب کی — پُر فضا ہے دلکشا ہے سرزمیں پنجاب کی
گلشنِ جنت نما ہے سرزمیں پنجاب کی — بلکہ جنت سے سوا ہے سرزمیں پنجاب کی
روح پرور جانفزا خاطر نشیں کیف آفریں — بے حد و بے انتہا ہے سرزمیں پنجاب کی
فیضِ قدرت سے شفا تاثیر ہے اس کی ہوا — قدرتی دار الشفا ہے سرزمیں پنجاب کی
انتخابِ کائناتِ آب و گل ہے ایشیا — انتخابِ ایشیا ہے سرزمیں پنجاب کی
مردِ میدانِ وغا ہے ہر مکیں پنجاب کا — ارضِ مردانِ وغا ہے سرزمیں پنجاب کی
یہ حقیقت ہے کہ پیداوار کی بہتات میں — ملک بھر کی رہنما ہے سرزمیں پنجاب کی
اس کا رُخ کرتے رہے جو قحط کے مارے ہوئے — اب بھی ان کا آسرا ہے سرزمیں پنجاب کی
جس کا ہم پلّہ نہیں دُنیا کی کوئی سرزمیں — سرزمیں وہ لے وفا ہے سرزمیں پنجاب کی

آخر کار شمعِ آزادی کے پروانوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور ہندوستانی عوام کی اُمنگیں بر آئیں جب ۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ آزادی حاصل ہونے کے بعد انہیں ہر شے بافراط نصیب ہو گی۔ ان کی حالت سدھرے گی غریبی اور تنگدستی سے نجات ملے گی۔ امیر و غریب کا امتیاز دور ہو گا۔ روزانہ ضروریاتِ زندگی آسانی سے میسر آئیں گی۔ لیکن افسوس کہ عوام نے حصولِ آزادی سے جو امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں لہذا عام لوگوں کے دلوں میں خوشی کی بجائے مایوسی بھر گئی۔ اور ہر طرف سے بے اطمینانی کا اظہار ہونے لگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد ملک نے ترقی کی کئی منزلیں طے کر لی ہیں۔ دیہات کی حالت پہلے سے بہت بہتر ہو گئی ہے۔ گاؤں گاؤں میں سکول جاری ہیں۔ ہسپتال کھل گئے ہیں۔ پکی سڑکیں بن گئی ہیں۔ گھر گھر بجلی پہنچ گئی ہے۔ زرعی پیداوار پہلے کی نسبت کئی گنا زیادہ بڑھ گئی

ہے۔ صنعت و حرفت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ لیکن سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بے روزگاری، غریبی اور جہالت بدستور قائم ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر دُکھ کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ و ادنیٰ ہر ایک میں اخلاقی گراوٹ آگئی ہے انسانی قدریں رفتہ رفتہ ناپید ہو رہی ہیں۔ رشوت خوری، خویش پروری، چور بازاری اور زر اندوزی کی وبا عام ہے۔ وفا صاحب نے اس صورتِ حال کو "شہر آشوب" کی شکل میں ایک نہایت زوردار اور فصیح و بلیغ نظم سپردِ قلم کی ہے۔ نظم کے کل گیارہ شعر ہیں لیکن سب کے سب مطلع۔ خاتمے پر جو مصرع کہا گیا ہے وہ نظم کی جان ہے۔ ملاحظہ ہو:

کیا کہئے کہ کیا شام و سحر دیکھ رہے ہیں
رنگِ فلکِ شعبدہ گر دیکھ رہے ہیں

حیرت سے اِدھر اور اُدھر دیکھ رہے ہیں
ماحولِ جہاں زیر و زبر دیکھ رہے ہیں

شوریدگیِ دَورِ قمر دیکھ رہے ہیں
ہر سمت بپا فتنہ و شر دیکھ رہے ہیں

اشراف کو خاشاک بسر دیکھ رہے ہیں
اشرار کو منظورِ نظر دیکھ رہے ہیں

وہ صورتیں بھی کرسیوں پر دیکھ رہے ہیں
جن میں کہ ہیں سگ اور خر دیکھ رہے ہیں

نیلام پہ ایمان بشر دیکھ رہے ہیں
ہر فرد کو دیوانہ زر دیکھ رہے ہیں

مٹتے ہوئے اقدارِ ہنر دیکھ رہے ہیں
ملتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھ رہے ہیں

حسرت زدہ ایک ایک نگر دیکھ رہے ہیں
افلاس میں ڈوبے ہوئے گھر دیکھ رہے ہیں

محنت کشوں کا حال بتر دیکھ رہے ہیں
چہروں پہ فلاکت کا اثر دیکھ رہے ہیں

خطرات سے پُر سیر و سفر دیکھ رہے ہیں
مخدوش ہر اک راہگزر دیکھ رہے ہیں

القصّہ جو کچھ پیشِ نظر دیکھ رہے ہیں
ہم دیکھ نہیں سکتے مگر دیکھ رہے ہیں

دم بستہ و با دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں

اب تک وفا صاحب کی سیاسی ملکی اور قومی نظمیں ہی زیر بحث لائی گئیں
وفا صاحب عمر کا بیشتر حصہ ایک ایسے وقت میں اخبار نویس رہے جب یہاں
تحریک آزادی پورے جوبن پر تھی۔ اور چونکہ حُبِ وطن کا جذبہ آپ کے دل میں
کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اس لئے آپ کے آتش بار قلم سے جوشیلی اور ولولہ انگیز
نظموں کا کثیر التعداد میں نکلنا عین قدرتی امر تھا یہاں تک کہ وفا صاحب کے
غزلیہ کلام میں بھی سیاسی رنگ کے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں۔ دراصل یہ
رنگ آپ کی افتادِ طبع کے عین مطابق ہے۔ آپ جیسے قربانی مجسم محبِ وطن کی
نظموں میں جو سوز و گداز اور درد و اثر ہو سکتا ہے وہ محتاج تشریح نہیں آیندہ
سطور میں ہم وفا صاحب کی ایسی نظموں کے نمونے پیش کریں گے جن
میں کائنات کی خارجی تصویر کشی اور داخلی کیفیات کی عکاسی جلوہ گر
ہے۔ شاعر اپنے احساسات اور تصورات کا پرتو نیچر میں دیکھتا ہے اور
نیچر میں جو سکون و اضطراب محسوس کرتا ہے اپنے دل کی بدولت کرتا
ہے۔ ہمارا شاعر قوسِ قزح کی دل فریب رنگینیاں دیکھ کر مسرور بھی
ہوتا ہے اور متعجب بھی۔ حیران اس لئے ہے کہ اب قوس قزح کے مشاہدے
سے اس کا دل نہیں اُچھلتا۔ اور وہ خیال کرتا ہے کہ وہ بے حس ہو گیا
ہے۔ اُسے ساون کے جھولے بے کشش معلوم ہوتے ہیں۔ اُسے سیر گلشن
سے کوئی راحت نصیب نہیں ہوتی کیونکہ شاعر کا اپنا دل ملکی غلامی کے باعث
ملول و محزون ہے۔ حالانکہ قوس قزح کی دل کشی آج بھی وہی ہے جو کل
تھی اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے ؎

جانفزا ہے کیا ترا نظارہ اے قوس قزح
چشم حیراں کا ہے تو گہوارہ اے قوسِ قزح

تو لبِ دریا فرازِ آسماں پہ جلوہ گر
عکس تیرا چادرِ آبِ رواں پر جلوہ گر

جلوہ آرائے طرب تیری شعاعِ جلوہ ہے
واہ واکیا شان ہے کیا ارتفاعِ جلوہ ہے
آہ گو اب بھی وہی ہے جلوہ آرائی تری
اور چشم وقفِ حیرت بھی ہے شیدائی تری
دیکھ کر تجھ کو مگر اب دل اُچھلنا کیوں نہیں
اسقدر بے حس ہے کیوں کروٹ بدلنا کیوں نہیں
تجھسے اس بے دردگی پر میں بہت شرمندہ ہوں
یہ سزا شاید اسی کی ہے کہ ابتک زندہ ہوں
وجد خیزی کا اثر ساون کے جھولوں میں کہاں
بوئے تسکیں گلشنِ ہستی کے پھولوں میں کہاں
وقفِ پامالی ہے میرا لالہ زارِ خرمی
خار سی دل میں کھٹکتی ہے بہارِ خرمی
چھیڑتی ہے دل کے چھالوں کو ہوا برسات کی
خون کے آنسو رلاتی ہے گھٹا برسات کی
روزگار اپنا ابھی کروٹ بدلنا کیوں نہیں
آخر تقدیر گردش سے نکلنا کیوں نہیں
آتے ہیں دورِ خزاں کے بعد ایامِ بہار
اک ہمیں کیوں باغِ عالم میں ہیں ناکامِ بہار
کیوں ہماری سرزمیں سے آسماں کو لاگ ہے
کیا اسی گلزار سے برقِ تپاں کو لاگ ہے
ہے طویل اپنے سلاسل ہائے غم کا سلسلہ
ختم ہوتا ہی نہیں اس پیچ وخم کا سلسلہ
آہ اب ہم تو جہاں ہیں شاد ہونے سے رہے
بندِ غم سے حشر تک آزاد ہونے سے رہے
تو ہمارے دیدہ و دل میں سمائے جایونہی
نقشۂ نیرنگیٔ عالم دکھائے جایونہی

"بہار آئی" کے عنوان سے ایک گیارہ اشعار کی چھوٹی سی نظم ہے۔ بہار آنے سے سارا عالم پُر بہار ہو جاتا ہے۔ گلستان و بیابان میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ بلبلیں چہچہاتی پھرتی ہیں۔ رندانِ بادہ خوار مے و مطرب کی تلاش میں

ہیں۔ مُردہ دلوں میں اُمنگیں جی اُٹھتی ہیں۔ آرزوؤں پر جوانی آجاتی ہے چاروں طرف مسرت ہی مسرت نظر آتی ہے۔ مگر ہمارا شاعر اس خوشگوار ماحول میں بھی اپنی دُنیا ویران دیکھتا ہے کیونکہ حزن وملال اس کے دل میں جاگزیں ہے اُس کو اس خارجی بہار کی کوئی خوشی نہیں۔ اُس کے دل میں غم واندوہ نے گھر کر رکھا ہے۔ نظم کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں سے

سحاب ِ زر فشاں آیا ہوائے مشکبار آئی
نرالی شان سے گلزارِ عالم میں بہار آئی

فضا کو عنبریں کرتی نسیم کوئے یار آئی
بپا ہے شور اطراف وجوانب میں بہار آئی

اُمنگیں جی اُٹھیں پھر آرزوؤں پر شباب آیا
دکھاتی شانِ اعجازِ مسیحائی بہار آئی

گلوں میں تازگی پیدا ہوئی رعنائی کانٹوں میں
گلستاں میں بہار آئی تو ہر شے پر بہار آئی

مچلتی کودتی ہنستی ہنساتی ناچتی گاتی
غرض ہر رنگ سے اٹھکھیلیاں کرتی بہار آئی

مری ویران دُنیا میں بہار آئے تو میں جانوں
مجھے کیا لے وفا اس سے کہ گلشن میں بہار آئی

جوانی یا بڑھاپے میں بچپن کا سنہری زمانہ کس کو یاد نہ آیا ہوگا۔ معصوم بچہ سورج۔ چاند۔ ستارے آسمان میں دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے۔ ان کو خوبصورت کھلونے سمجھ کر پہروں دل بہلاتا ہے۔ اُسے آگ اور پانی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا وہ آگ کو پکڑنے کے لئے اتنے ہی شوق سے لپکتا ہے جتنا پانی میں کودنے کے لئے۔ اس کی ننھی جان کو عشق کا آزار نہیں ستاتا۔ وہ چڑیوں سے کھیلتا ہے۔ چڑیاں اُسے اپنا ہمجولی سمجھ کر اُس کے قریب آجاتی ہیں۔ خود کھیلتی ہیں اور اُسے کھلاتی ہیں۔ وفا صاحب کو بچپن کی یاد اب ایسے معلوم ہو رہی ہے جیسے کوئی خواب دیکھا یا کوئی افسانہ سنا تھا۔ بچپن کا معصوم زمانہ اب کسی طرح واپس نہیں آسکتا۔ نظم ملاحظہ ہو سے

آہ یاد آتے ہیں رہ رہ کر مجھے بچپن کے دن — گنبدِ آفاق جب میرا عجائب خانہ تھا
دیکھتا تھا دیدۂ حیرت سے میں ہر چیز کو — آگ اور پانی میں مجھ کو امتیاز اصلا نہ تھا
ساحت کون و مکاں تھی تختۂ مشقِ خیال — عرصۂ بازارِ عالم میرا خلوت خانہ تھا
خواب میں پریاں نظر آیا نہ کرتی تھیں مجھے — یعنی میں دیوانہ گیسوئے پریشاں کا نہ تھا
آج میرے سائے تک سے ہوتی ہے وحشت جنہیں — آہ اُن چڑیوں سے بچپن میں مرا یارانہ تھا

لے وفا محسوس ہوتا ہے بقول دردِ آج
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

وفا صاحب نے .. کسان کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ خود ایک کسان گھرانے میں پیدا ہوئے۔ دیہاتی ماحول میں پرورش پائی کسان کو اپنے ارد گرد ہوائیں بائیں محنت و مشقت کرتے دیکھا۔ اس کا روزمرہ کا کام صبح سویرے طلوعِ آفتاب سے بہت پہلے شروع ہو جاتا ہے جب سارا عالم میٹھی نیند سوتا ہے ؎

لیکے عین اسوقت اٹھنا ہے خدا کا نام تو — یعنی پیارا جان سے رکھتا ہے اپنا کام تو
ملتوی کرتا ہے کل پر راحت و آرام تو — کھیت میں جاتا ہے پی کر چھاچھ دو اک جام تو

ہل چلاتا ہے وہاں اک رنگ میں گاتا ہوا
گرد و پیش اپنے سرور و کیف برساتا ہوا

گرمی ہو یا سردی۔ مینہ ہو یا آندھی۔ کسان کے معمول میں کوئی فرق نہیں پڑتا وہ ہر قسم کے موسم میں اپنا کام بڑے انہماک سے کرتا ہے ؎

فرق آئے تیرے اس معمول میں یہ ہے محال — پائے استقلال تیرا ڈگمگائے کیا مجال
تجھ کو ہوتا ہے نہ گرمی کا نہ سردی کا خیال — تو کئے جاتا ہے محنت شوق دل سے ماہ و سال

دیتی ہے قدرت تری محنت کا پھل آخر تجھے
ملتا ہے ہاں ثمرۂ کشتِ عمل آخر تجھے

کسان کو عام طور پر اَن داتا کہا جاتا ہے۔ اس کی نیک کمائی سے چرند پرند۔ حیوان۔ انسان سب بہرہ ور ہوتے ہیں ؎

شادمانی کا چھلکتا ہے ترے چہرے پہ نُور
ہوتا ہے اُسوقت حاصل تیرے دل کو وہ سرور

بہرہ ور ہوتے ہیں موش و مردم و مور و طیور
حصّہ جاتا ہے کمائی کا تری نزدیک و دُور

بُخل یوں خیرات دینے میں بھی تو کرتا نہیں
دست سائل کو کبھی بے آبرو کرتا نہیں

اس اکتیس اشعار کی نظم کا آخری بند ملاحظہ ہو ؎

تیری فصلوں کے پکانے کو ہے مہرِ نور بار
آبیاری کو ترے کھیتوں کی ہے ابرِ بہار

تیری خاطر ہیں یہ ساری نعمتیں اے دوستدار
پنکھا کرنے کے لئے تجھ کو ہوائے خوشگوار

تو ہے خلقت پر خدا کی مہربانی کا سبب
ورنہ ہیں دولت کے بندے تو گرانی کا سبب

اُردو کی غزلیہ شاعری میں آنسو کے متعلق متفرق اشعار اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر انہیں جمع کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ بعض شعرا نے پوری نظم کی صورت میں اس مضمون پر طبع آزمائی کی ہے۔ مگر ہماری نظر سے ایسی کوئی نظم نہیں گزری جسے وفا صاحب کی نظم کے مقابلے میں پیش کیا جا سکے۔ یہ نظم اگرچہ صرف پانچ اشعار کی ہے لیکن نہایت جامع ہونے کے علاوہ اتنی موثر اور دل آویز ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ دیکھئے اور لطف اندوز ہوجیے ؎

آنسو

دریائے غم کا ہے گہر آب دار تو
پاتا ہے پرورش صدفِ چشم زار میں

کانٹا یہ وہ ہے جس میں تُلا بار بار تو
نوکِ مژہ پہ کھلتا ہے تیرا حسب نسب

تیرا وجود حاملِ طغیانِ اشتیاق | طوفانِ اضطراب کا سرمایہ دار تُو
اگلی مصیبتوں کا جو اک پیش خیمہ ہے | پچھلی مسرتوں کی ہے وہ یادگار تُو
قاصر زبان ہوتی ہے جب عرض حال سے | بنتا ہے ترجمانِ دلِ بے قرار تُو

ایسی ہی ساڑھے پانچ شعر کی ایک اور نظم بعنوان "کشمیر جنت نظر" ہے
میرا خیال نہیں کہ کشمیر کے نظر افروز مناظر کی ایسی خوبصورت اور دلکش تصویر
کسی اور شاعر نے پیش کی ہو ۔

یہ ہے رنگین بہاروں کی دنیا | رُوح پرور نظاروں کی دُنیا
وادیوں کہساروں کی دنیا | ندیوں جوئباروں کی دُنیا
عنبریں شاخساروں کی دنیا | گل زمیں راہگزاروں کی دُنیا
دل کشا مرغزاروں کی دنیا | جاں فزا آبشاروں کی دُنیا
گل رُخوں گل عذاروں کی دنیا | مہوشوں مہ پاروں کی دُنیا

حُسن کے تاجداروں کی دُنیا

آخری تین مصرعوں سے نظم میں جو وجدانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے ۔ وہ محسوس ہی
کی جا سکتی ہے بیان میں نہیں آسکتی ۔ آخری مصرع ۔

حُسن کے تاجداروں کی دنیا

ساری نظم کی جان ہے اور سحر طرازی کے باب میں حرفِ آخر کی حیثیت کا حامل ہے ۔
وفا صاحب کا ایک اور حسین و جمیل اور کیف آور شاہکار ملاحظہ فرمائیے ۔
اس کا عنوان ہے ۔ اعتراف محبت ۔

جہاں تک دنیوی نقطۂ نگاہ کا تعلق ہے عشقِ حقیقی بھی انسان کو کسی
کام کا نہیں رہنے دیتا ۔ اور عشق مجازی تو اس کی مکمل تباہی و بربادی اور
خواس باختگی کا موجب ہوتا ہے ۔ مگر وفا صاحب نے پچیس اشعار کی اس

نظم میں عشق مجازی کو انسانی ترقی کا ذریعہ گردانا ہے۔ اور اس نظم کو تین
حصوں میں تقسیم کر کے پہلے حصّے میں اپنی شاعرانہ عظمت بیان کی ہے اور
کہا ہے ؎

دوست کرتے ہیں مری طبعِ رواں کا اعتراف　　دشمنوں کو ہے مرے زورِ بیاں کا اعتراف
قسمتِ ہر کس نہیں میرا مقامِ شاعری　　مجھ سے نیچے ہے بہت نیچے ہے بامِ شاعری
شاعری میں ایک عالم پر ہوں میں چھایا ہوا　　شاعروں میں مستند ہے میرا فرمایا ہوا

دوسرے حصے میں اپنے کمالِ فن کو محبوب کا قرب حاصل کرنے کی آرزو
سے منسوب کر دیا ہے اور فرمایا ہے ؎

لیکن اے مطلعِ فروزِ عالمِ انوارِ حسن　　اے جہانتابِ نیّرا اے تجلی زارِ حسن
کسبِ ضو کرتا ہوں تیرے حسنِ عالمگیر سے　　عکس لیتا ہوں خیالوں کا تری تنویر سے
اڑتا ہوں تیری ہوائے شوق میں افلاک پر　　کرتا ہوں نغموں کی بارش ساکنانِ خاک پر

صرف یہی نہیں۔ اپنی موجودہ بلند پائیگی کو ناکامی سمجھتے ہوئے راہِ ترقی پر
گامزن رہنے کا عزم کر رکھا ہے ملاحظہ ہو ؎

اے منوّر آفتابِ آسمانِ آرزو　　تجھ سے پُرتنویر ہے میرا جہانِ آرزو
گرمجوشِ آرزو رکھتا ہے تیرا اشتیاق　　تیرے شوقِ قرب میں ہوں میں سراپا اشتیاق
اپنی ہستی کو ترے قابل بنانا ہے مجھے　　یعنی خود کو اور بھی اونچا اٹھانا ہے مجھے
اس تمنا سے کہ تیرے دل میں پاؤں بار میں　　بہرِ تکمیلِ فضیلت ہوں رہینِ کار میں

یہ آرزو کیا ہے اور کتنی معصوم ہے اس کی وضاحت ذیل کے اشعار میں دیکھئے۔

میری شہرت پر جو فرطِ ناز سے اترائے تو　　دلخوشی سے مجھ کو اے جانِ جہاں اپنائے تو
شغلِ خوشوقتی تو جب ہم خاندانوں میں کرے　　فخر سے مجھ کو شمار اپنے یگانوں میں کرے
ہم سنوں کے ساتھ تو جس وقت محوِ سیر ہو　　تیری خوشنودی کا باعث میرا ذکرِ خیر ہو

جذبۂ محبت کے زیرِ اثر خاک بسر ہو کر سوالی مجسمہ بن جانے کی بجائے محبوب کی نگاہِ التفات میں جگہ پانے کے لئے ترقی کے میدان میں مصروفِ تگ و تاز رہنا ضبطِ محبت کی انتہا ہے۔ نظم کے آخری دو شعر ؎

تیری خوشنودی ہے میرا مدعائے زندگی	ہاں یہی مقصد ہے میرا رہنمائے زندگی
زندہ ہوں تیرے لئے اے رشکِ مہرو ماہ میں	آج کرتا ہوں تجھے اس راز سے آگاہ میں

جن پر نظم کا تیسرا حصہ مشتمل ہے اسی ضبط کے آئینہ دار ہیں۔

مسطورِ ذیل میں وفا صاحب کی دو تصویری نظمیں سرسری وضاحت کے ساتھ پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ نظمیں مرحوم مولانا تاجور نے خاص فرمائش پر اپنے ماہنامہ "ادبی دنیا" میں شائع کرنے کے لئے وفا صاحب سے کہلوائی تھیں۔

پہلی تصویری نظم کا عنوان ہے۔ "سچی موسیقی"

یہ نظم بھی "اعترافِ محبت" کی طرح طویل اور پچیس اشعار پر مشتمل ہے۔ تصویر میں وادیٔ کشمیر کا ایک پُر بہار منظر دکھایا گیا ہے۔ ایک نوعمر لڑکا ساز پر سریلی آواز میں گا رہا ہے۔ پاس ہی ایک کم سِن حسینہ والہانہ اشتیاق سے گانا سُن رہی ہے۔ اِدھر اُدھر پہاڑی بکریاں گھاس چر رہی ہیں۔ وفا صاحب نے اس منظر کی شعری تصویر جس خوبی و خوش اسلوبی سے کھینچی ہے اس کا اندازہ نظم کے چند مندرجہ ذیل اشعار سے کیجئے ؎

خوش گلو ہے کس قدر اے مطربِ نوخیز تُو	کس ادائے محویت سے ہے ترنم ریز تُو
ہو رہی بارشِ تاثیر نغموں سے ترے	گونجتی ہے وادیٔ کشمیر نغموں سے ترے
چرخ ازرق آئینہ دار طلسمِ نغمہ ہے	ہر سبزہ کوہی گرفتارِ طلسمِ نغمہ ہے
اور اک دوشیزہ یعنی غنچۂ بابِ شباب	دامنِ معصومیت ہے جس کا بیداغ شباب
اس ادا سے وہ یکے از سامعینِ نغمہ ہے	آنکھ ہے محوِ تحیّر دل رہینِ نغمہ ہے

کر رہا ہے رقص اس کا دل تری آواز پر　　سحرِ نغمہ ہے عیاں حسن فسوں پرداز پر
سر بسر محوِ صدائے دلپذیرِ نغمہ ہے　　ساکت و بےحس ہے، یوں گویا اسیرِ نغمہ ہے
نغمے اس مشتاقِ نغمہ کو سنائے جا یونہی　　گائے جائے مطربِ نوخیز گائے جا یونہی!

نغمہ کی کیفیت آفرینی اور جادو اثری ایسے فصیح و بلیغ انداز میں بیان کرنا وفا صاحب ہی کا حصّہ ہے۔ آخری شعر ؎

نغمے اس مشتاقِ نغمہ کو سنائے جا یونہی　　گائے جائے مطربِ نوخیز گائے جا یونہی

کا ایک ایک لفظ اعجازِ فصاحت کا حامل ہے۔ اس سے پہلا شعر ؎

سر بسر محو صدائے دلپذیرِ نغمہ ہے　　ساکت و بےحس ہے یوں گویا اسیرِ نغمہ ہے

کمالِ بلاغت کا نادر ترین نمونہ ہے۔

دوسری تصویری نظم ہے "حسن سوگوار" اس تصویر میں ایک نوجوان حسینہ رات کے سناٹے میں اپنے خاوند کی نعش پر بیٹھی گریہ و زاری کر رہی ہے۔ اس دردناک اور یاس انگیز منظر کو بیان کرتے ہوئے وفا صاحب فرماتے ہیں ؎

آہ غلبہ پالیا ہے موت نے بیمار پر　　ہوگئی ہے مُردنی طاری در و دیوار پر
طاق و روزن ہیں اُداس اور شمع روشن ہے اداس
وہ اداسی ہے کہ ہے گھر بھر کی ہر اک شے اداس
محشرِ فریاد و شیون ہے بپا اس گھر میں آج
کچھ نہیں فریاد و شیون کے سوا اس گھر میں آج
محوِ فریاد و فغاں نوبیوہ غمناک ہے
فرطِ غم سے شکوہ سنجِ گردشِ افلاک ہے
روئے پُر انوار سے اک حیرتِ غم آشکار
موئے عنبر بار سے انداز ماتم آشکار

حادثہ ہے ایک اور جانکاہ رونا حسن کا
کس کی آنکھیں ہیں کہ دیکھے جان کھونا حسن کا

پہلے دو شعر اسی اداسی کی صحیح عکاسی ہیں جو ایک نوجوان بنی برتا استری کو اپنے پیارے پتی کی بے وقت وفات سے گھر کے در و دیوار پر طاری نظر آتی ہے۔ تیسرا شعر حسنِ بیان کا ایک بے نظیر نمونہ ہے۔ پہلے مصرع کے الفاظ "فریاد و شیون" ایسے استادانہ انداز سے دوسرے مصرع میں لائے گئے ہیں جس سے شعر بلند اور زور دار بھی ہو گیا ہے اور موثر بھی۔

وفاؔ صاحب کی غزلوں میں حسن کے متعلق اس نظریہ کی جھلک جابجا نمایاں ہے کہ دنیا کی ساری نعمتیں اور راحتیں حسن کے لئے ہیں۔ مندرجہ بالا اشعار کے آخری تین شعر اسی نظریہ کی روشنی میں حسن کا آفت رسیدہ اور اشکبار ہونا یدرجۂ انتہا دلخراش حادثہ ہے۔ آخری شعر کا دوسرا مصرع۔

"کس کی آنکھیں ہیں کہ دیکھے جان کھونا حسن کا"

زورِ بیان اور تاثیر کلام کا بہترین اور موثر ترین نمونہ ہے۔ اگلے دو شعر سے

حسن دنیا میں نہیں ہے آنسو بہانے کے لئے — حسن دنیا میں نہیں صدمے اٹھانے کے لئے
کون سن سکتا ہے یہ نوحہ زبانِ حسن سے — کیا علاقہ یاس و حرماں کو جہانِ حسن سے

اس نظریہ کی مزید وضاحت ہیں۔

اس نوحہ میں مغموم بیوہ کے جذبات کی ترجمانی ایسے پیرایہ میں کی گئی ہے کہ اسے پڑھنے اور سننے والوں پر رقت کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ملاحظہ ہو سے

توڑ کر عہدِ وفا تم بے وفا کیوں ہو گئے — چھوڑ کر تنہا مجھے مجھ سے جدا کیوں ہو گئے
کیا اسی کا نام ہے شرطِ رفاقت کا نباہ — ہاں اکیلے راہیِ ملکِ بقا کیوں ہو گئے
تم تو کہتے تھے کہ تیرا ہوں میں ہرجائی نہیں — پھر مرے ہوتے ہم آغوشِ قضا کیوں ہو گئے

نیز سا لگتا ہے یہ معصوم ننھی کا سوال   کیا کہوں اس سے ترے ابا خفا کیوں ہو گئے
کل تو تھی بے انتہا بھی مجھ پہ شفقت کی نظر   آج اتنے بے نیازِ انتہا کیوں ہو گئے
کیوں نہیں ہوتا تمہارے دل میں پیدا اضطراب   میرے نالے آہ اتنے نارسا کیوں ہو گئے
آہ اب ہر شام میں کس کا کروں گی انتظار   تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کیوں ہو گئے

نوحہ کیا ہے۔ زندگی کی خوشیوں اور مستقبل خوابوں کا رُلا دینے والا مرثیہ ہے ہر شعر درد بھرے دل کی درد خیز آواز ہے۔ تیسرے شعر کے دوسرے مصرع کا ٹکڑا "ہم آغوشِ قضا" خاص طور پر قابلِ داد ہے۔ ہم آغوشِ قضا ہونا کے معنی ہیں وفات پانا۔ مگر ان الفاظ کو نوحہ گر حسینہ کی زبان سے نکلوا کر وفا صاحب نے رشک وحسد کا ایک اچھوتا مضمون پیدا کر دیا ہے۔ اور قضا کو اس کی سوکن بنا دیا ہے کہنے کی ضرورت نہیں کہ سوکن کا جلایا سب سے بڑا جلایا ہے۔

نوحے کا آخری شعر

آہ اب ہر شام میں کس کا کروں گی انتظار
تم ہمیشہ کے لئے مجھ سے جدا کیوں ہو گئے

اس اندوہگیں تاریکی اور یایوسی کا آئینہ دار ہے جس سے اپنے پران پتی کی ابدی جدائی میں عورت دائمی طور پر مبتلا ہو جاتی ہے۔ معمول کے مطابق شام کو آ جانے کے عادی محبوب خاوند کا انتظار بڑا راحت بخش ہوتا ہے۔ اس راحت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جانا جان شکن صدمہ سے کم نہیں۔

"جمہوریت" پولیٹکل سائنس کا ایک خشک اور غیر شاعرانہ موضوع ہے۔ اس موضوع کو شعری سانچے میں ڈھالنا اور رنگ تغزل کی آمیزش دیکر نظم کو فصاحت و بلاغت کے درجۂ کمال تک پہنچا دینا وفا صاحب ہی کا سحر ہے۔ اس دل آویز چھوٹی سی نظم میں تراکیب اور الفاظ کا حسین انتخاب جس

اُستادانہ انداز سے کیا گیا ہے وہ وفا صاحب کی قادر الکلامی پر دال ہے ۔ نظم کے تمام اشعار اتنے متوازن اور مترنم ہیں کہ نظم ایک بے مثال دلکشی کی حامل ہے ۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

ضامنِ بہبودِ خاص عام ہے جمہوریت
عافیت کا ایزدی پیغام ہے جمہوریت

شاہکارِ حکمتِ ایام ہے جمہوریت
پاسدارِ حرمتِ اقوام ہے جمہوریت

تقویت ملتی ہے جس سے قومیت کی رُوح کو
حُرّیت کا وہ مفرّح جام ہے جمہوریت

تابع ماحول استحکام ہے آسودگی
خالقِ ماحول استحکام ہے جمہوریت

سر فروشانِ وطن کے لامثال ایثار کا
بیش قیمت بے بہا انعام ہے جمہوریت

شرط ہے صدق و صفا جمہوریت کے واسطے
ورنہ اک مکر و ریا کا دام ہے جمہوریت

دشمنِ جمہوریت ہیں وہ حریصِ اقتدار
جن کے باعث ملک میں بدنام ہے جمہوریت

جان سکتے ہیں کہاں یہ زر پرست ابنائے وقت
کیا بلا ہے کس بلا کا نام ہے جمہوریت

ہاں یہی خود کام اور بدکام ہیں اس کا سبب
ہند میں اتنگ اگر ناکام ہے جمہوریت

منہ دکھا سکتے ہیں جبتک عام لوگوں کو یہ لوگ
خوابِ موہوم و خیالِ خام ہے جمہوریت

وفا صاحب کی نظمیہ شاعری کا ایک اور شاہکار "ابرِ بہار" ایک مختصر سی نظم ہے۔ جو معنوی اور صوری خوبیوں سے سرتاپا مرصّع ہے۔ ابرِ بہار کی طرح مصرع پر مصرع جھومتا لہراتا چلا آرہا ہے۔ اس نظم کی رنگینی۔ کیف آوری اور وجد آفرینی بیان سے باہر ہے۔ گرمی کی شدت سوہان رُوح ہو جاتی ہے تو ہر شخص بارش کے لئے دست بدعا ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ حیوانات اور نباتات بھی ابر رحمت کا بے قراری سے انتظار کرتے ہیں۔ نظم میں موسیقیت اور ترنم بدرجۂ انتہا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

خلقِ خدا ہے تیرے لئے بے قرار آ
مور و طیور کو ہے ترا انتظار آ

تکتا ہے کب سے راہ تری بادہ خوار آ
بیتاب ہے گدائے سرِ راہگزار آ

محوِ دُعا ہے زاہدِ شب زندہ دار آ
ہر دل سے اُٹھ رہی ہے صدا بار بار آ
پھیلائے دامنوں کو ہیں اُمیدوار آ

دہقان کی نگاہ ہے یاس آشکار آ
ہر لب پہ التجا ہے بصد انکسار آ
لے کر پیامِ رحمتِ پروردگار آ

موتی بکھیرتا ہوا ابرِ بہار آ

گرمی سے مضطرب ہے بہت جانِ زار آ
عشرت فزا منظرِ شہر و دیار آ
وقفِ غم و ملال ہیں لیل و نہار آ
مُرجھا گئے ہیں شاخ و گل و برگ و بار آ
صورت دکھا کے لوٹ نہ جا بار بار آ

تجھ پر ہے زندگی کا بس اب انحصار آ
عالم ہے سارا عالمِ گرد و غبار آ
اے باغ و دشت و کوہ کے شادابی کار آ
پیاسا کھڑا ہے سر و لبِ جوئبار آ
آنے میں اور دیر نہ کر ریختار آ

آ اور آنے کی طرح ابرِ بہار آ

اس نظم کا آخری بند بھی اسی پایہ کا تھا لیکن بدقسمتی سے وفا صاحب کو سارے کا سارا یاد نہیں رہا۔ صرف تین شعر جو حافظے میں رہ گئے ھدیۂ ناظرین ہیں ؎

پھر دھوپ ہو چلی ہے بہت ناگوار آ
نکلا نہیں زمین کے دل کا بخار آ
مشرق سے جھومتا ہوا مستانہ وار آ

پھر تیوروں سے اُڑنے لگے ہیں شرار آ
بیٹھا نہیں غبارِ سرِ رہ گزار آ
مغرب سے اُٹھ کے دوشِ ہوا پر سوار آ

وفا صاحب نے جہاں بے شمار ملکی آزادی کے گیت اور حب الوطنی کے نغمے گائے ہیں اور علاوہ ازیں جذبات نگاری اور قدرت کی منظر کشی کے عدیم المثال مرقع پیش کئے ہیں وہاں چند مذہبی پیشواؤں کی شان میں بھی نظم کی صورت میں اپنی شردھا نجلی کے پھول بھینٹ کئے ہیں۔ "روحانیات" کے زیرِ عنوان اگرچہ آپ کی ایسی مذہبی نظموں کی تعداد زیادہ نہیں لیکن جو

نظمیں آپ نے اس ضمن میں کہی ہیں اُن میں آپ کے زورِ بیان اور قادر الکلامی کی مثالیں جا بجا نظر آتی ہیں۔ اکثر نظموں کی ہیئت غزل سے ملتی جلتی ہے اور وہ تمام وکمال شعریت و تغزل کی حامل ہیں۔

تقسیمِ وطن کے بعد وفا صاحب کو اپنے بھتیجے پنڈت ملک راج کے ہاں قادیان (گورداسپور) میں کچھ دیر قیام کرنا پڑا۔ جماعتِ احمدیہ کی نیک اطواری خلوص دلی اور انسان دوستی کے متعلق جو پہلے دُور سے سُن چکے تھے اب انہیں قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ شاعر کے حساس دل نے انفرادی و مجموعی طور سے اس جماعت کے اخلاقِ حسنہ کا اثر قبول کیا جو ایک شگفتہ نظم کی صورت میں رونما ہوا۔ نظم کا عنوان ہے "عقیدت کا سلام"۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

نیک بندوں سے کبھی خالی نہیں ہوتا جہاں — ابتدائے آفرینش سے ہے ایسا انتظام
آج بھی مرزا بشیر الدین احمد اے ندیم — اس جہاں میں ایک ہیں نیکی مجسّم لاکلام
خلق کی خدمت میں حاجتمند کی امداد میں — امتیازِ ہندو و مسلم سے بالاتر مدام
اور پیرو اُن کے یعنی احمدی فرقہ کے لوگ — گامزن رہتے ہیں راہِ حق پہ روز و شب تمام
آدمیت کا نمونہ اُن کا ہے ایک ایک فرد — سربسر انسانیت کے پیکر اُن کے خاص و عام
حلم کی، اخلاص کی، اخلاق کی زندہ مثال — خوش مزاج و خوش خصال و خوش کلام
ان روایات حسیں کا جو علم بردار ہے — پہنچے اُس فرقے کے رہبر کو عقیدت کا سلام

وفا صاحب کی نظمیہ شاعری کے نمونوں کا جائزہ پیش کیا گیا۔ آپ ایک واحد ایسے شاعر ہیں جنہیں غزل اور نظم کہنے میں یکساں کمال حاصل ہے۔ آپ جتنے بلند پایہ غزل گو ہیں اتنے ہی عظیم المرتبت نظم گو بھی ہیں۔ آپ کی نظم پر اکثر غزل کا گمان گزرتا ہے۔ آپ نظم میں محض بے جان قافیہ پیمائی نہیں کرتے بلکہ اسے شعریت کے زیور سے آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں۔

وفا صاحب نے نظمیں تو بہت لکھی ہیں لیکن کلام کو محفوظ رکھنے پر اُن کی توجہ کبھی مبذول نہیں ہوئی۔ یہ نظمیں ملک کے متعدد اخبارات اور رسائل میں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر بد قسمتی یہ ہے کہ اپنی نظموں والے پرچے بھی سنبھال کر نہیں رکھے۔ اب وہ اخبارات اور رسالے ہی نہ رہے۔ تو نظمیں کہاں سے ملیں۔

چھٹا باب

محاسنِ کلام

وفاؔ صاحب جتنے بلند پایہ غزل گو ہیں اتنے ہی عالی مرتبہ نظم نگار بھی۔ شاعرانہ صلاحیتوں کے علاوہ انہیں نثر لکھنے میں بھی قدرت سے وہ دسترس حاصل ہوئی ہے جو شاید و باید۔ زندگی کا بیشتر حصّہ اخبار نویسی میں گزرا اور اخبار نویسی بھی ایسے وقت میں کی جب ملک میں تحریک آزادی پورے جوبن پر تھی۔ ایک طرف غیر ملکی حکومت کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنا اور دوسری طرف عوام الناس میں حب الوطنی کے احساسات بیدار کرنا اُس وقت کی صحافت کا ایک بنیادی نقطہ تھا۔ اس میدان میں بھی وفاؔ صاحب کے آتش بار قلم نے نظم و نثر کے وہ جوہر دکھائے کہ بہت جلد اُن کے صحافت پیشہ معاصرین اُن کے مدّاح و معترف ہو گئے۔ علامہ تاجورؔ مرحوم لکھتے ہیں کہ یہ برقانی الفاظ میں بجلیاں بھر دیتے ہیں۔ قانون ڈنڈا لئے ان کے پیچھے پھرتا ہے۔ یہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں لیکن قانون کے ہاتھ نہیں آتے۔ گویا وفا صاحب کی یہ ایک امتیازی شان ہے کہ وہ نظم۔ غزل اور نثر نویسی میں یکساں طور پر دادِ کمال دیتے ہیں۔

وفاؔ صاحب کی شاعری کا مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہو گا کہ انہوں نے کلاسیکی طرز اور مقررہ ادب آداب کی سختی سے پابندی کی ہے۔ زبان کی صحت بیان کی خوبی۔ الفاظ کا برمحل استعمال اور لفظی مناسبتوں کا لحاظ رکھنا ان کی شاعری کے نمایاں خارجی محاسن ہیں۔ احساس کی گرمی اور جذبے کی شدّت

ان کے اشعار میں رواں دواں محسوس ہوتی ہے۔ مگر ان کا خاص انداز یہ ہے کہ وہ لفظی مناسبتوں کے ساتھ اس کو معرض اظہار میں لاتے ہیں حسنِ تکرار، مراعات النظیر اور صنعتِ تضاد کی بہت اچھی مثالیں ان کے کلام میں بکثرت ملتی ہیں۔ تکرار الفاظ ان کے پیرایۂ بیان کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ خاصا مشکل اور خطرناک انداز ہے۔ یہاں مشاقی کے کمال کی آزمائش ہوتی ہے۔ خالص صنعت گری کی نمود بھی اس پھیر میں بڑی آسانی کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ وہ اس سلیقے اور ہنرمندی سے لفظوں اور ٹکڑوں کو مکرر لاتے ہیں کہ حسنِ ادا کا رنگ چمک اٹھتا ہے۔ نمونہ کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

جب نہ ہوتا تھا غم جدا دل سے
کس زمانے میں کیا نہ ہوتا تھا

غم سے اب دل جدا نہیں ہوتا
کس زمانے میں کیا نہیں ہوتا

دوستی کے نام پر دوستی کی آڑ میں
دوستوں نے اے وفا دوست پیچ کھائے ہیں

اس کا گلہ بجا کہ زمانہ بدل گیا
اس کا علاج کیا کہ زمانہ بدل گیا

ہمارے حال پر ان کی نظر مشکل سے ہوتی ہے
ہمارے حال کی ان کو خبر مشکل سے ہوتی ہے

نہیں ہاں ہاں نہیں آساں بسر کرنا شبِ غم کا
شب غم اے دلِ ناداں بسر مشکل سے ہوتی ہے

غم کے کھانے والوں کو کھا جاتا ہے غم آخر
غم کا کھانا مشکل ہے غم کا کھانا سہل نہیں

کیا جانے آکے جائے نہ جائے خزاں کا دور
اور جا کے موسم آئے نہ آئے بہار کا

اثر نالۂ درد کا ہو گیا
وہ بے درد، درد آشنا ہو گیا

زمانہ ہے کیوں مائلِ انقلاب
زمانے میں کیا انقلاب آ گیا

ہم کو غرض بہار سے، ہم سے غرض بہار کو
کنجِ قفس میں چھیڑے زمزمۂ بہار کیا

کیا مہربانیاں تھیں کیا مہربانیاں ہیں
وہ بھی کہانیاں تھیں یہ بھی کہانیاں ہیں

ہوتا ہے جو کچھ اس کا بھی لیتے ہیں اثر ہم
ہوتا ہے جو کچھ اُس کی بھی دیتے ہیں خبر ہم

حالات کی اصلاح تو ہے دور کی اک بات
حالات کو پہلے سے کبھی پاتے ہیں اثر ہم

انہیں تازہ بنائے شکوہ پیدا ہو ہی جاتی ہے
جو ہم کچھ بر بنائے شکوہ باہم بھی کہتے ہیں

سنتا ہے کوئی کس کی کس کو کوئی سنائے
ہر ایک کی زباں پر اپنی کہانیاں ہیں

ہو نہ سکا ہم سے ترک، کر نہ سکے ترک ہم
راہ تیری بار بار، شام و سحر دیکھنا

دلِ ناداں سمجھ جائے گا لیکن
دلِ ناداں کو سمجھانا پڑے گا

اِدھر بڑھتے بڑھتے بڑھا دستِ شوق
اُدھر آتے آتے رجب آ گیا

موت علاجِ غم تو ہے، موت کا آنا سہل نہیں
جان سے جانا سہل سہی جان کا جانا سہل نہیں

ہمدردی ہمدردی ہے، جان ہی لے کر ٹلتے ہیں
ان ظالم ہمدردوں سے جان چھڑانا سہل نہیں

ہر کسی سے شکوۂ اہلِ جہاں کیا فائدہ
ہر کسی سے شکوۂ اہلِ جہاں کیا کیجئے

مردِ میدانِ وغا ہے ہر مکیں پنجاب کا
ارضِ مردانِ وغا ہے سرزمیں پنجاب کی

کس سے ہوا ترکِ تمنا یہاں
کس نے یہاں ترکِ تمنا کیا

دشمنوں کو دشمنوں سے شکوہ کیوں
دوستوں نے دوستوں سے کیا کیا

خوفِ طوالت سے اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ ورنہ اُن کے کلام کا بیشتر حصہ ایسے اشعار سے مزیّن ہے جن میں تکرار لفظی کے دلچسپ اور حسین و جمیل نمونے ملتے ہیں۔ اب لفظی توازن و تقابل کے چند نمونے ملاحظہ ہوں سے

بیٹھے ہیں آس رکھ کے ترے التفات کی
اُٹھیں گے نا گہاں ہو کے تری راہگزار سے

یا چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا پائے شوق
یا اتنا ناتواں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم

یارب یہ جلوہ گاہ ہے کس رشکِ ماہ کی
یارب یہ میں کہاں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم

کیا ضرورت ہے زمانے کو ہماری اے وفا
کس بھروسہ پر زمانے سے خفا ہو جایئے

نشاطِ شب و روز تجھ کو نصیب
مرا حصہ شام و سحر کا عذاب

مشکل نہ تھا مقابلہ تمکینِ یار کا
مشکل یہ ہے کہ دل ہی نہیں اختیار کا

اندازۂ نشاطِ ملاقات کیجیے
خمیازۂ نشاط مگر کچھ نہ پوچھیے

ٹوٹی نہ آس وعدۂ فردا کی اے وفا
چھوٹی نہ جان کشمکشِ انتظار سے

آئے گا چین مل کے پسِ مرگ خاک میں
جائے گا جان لے کے مرضِ انتظار کا

ہچکیوں میں کٹ گیا دن اے وفا
سسکیوں ہی میں شب بھی کٹ جائے گی

ہوتے ہی ہوتے ہو گی حقیقت ظہور یاب
اٹھتے ہی اٹھتے اٹھے گا پردہ مجاز کا

خون پینے والوں کو پوچھتا نہیں کوئی
دودھ پینے والے اب مرتبے بھی پاتے ہیں

دشمنوں سے ہوا کبھی جو کبھی نہ کھاتے ہم
دوستوں سے دانستہ وہ فریب کھائے ہیں

زخم وہ کیا جو بھر گیا آخر
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

یا وہ شان تھی کہ جب اپنے تھے پرائے بھی
یا یہ حال ہے کہ اب اپنے ہی پرائے ہیں

شاہکارِ حکمتِ ایّام ہے جمہوریت
پاسدارِ حکمتِ اقوام ہے جمہوریت

تابعِ ماحولِ استحکام ہے آسودگی
خالقِ ماحولِ استحکام ہے جمہوریت

تھے اُن کے بھی جگر داغ داغ پائے ہیں

دیکھنے میں جو لشہر باغ باغ پائے ہیں

ہر طرف تھے کل جہاں بلبلوں کے چہچہے
اس چمن پہ قابض آج بوم و زاغ پائے ہیں

ساتھ تقدیر نے کبھی نہ دیا
کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی

عشق زود اعتماد ہوتا ہے
حسن زود آشنا نہیں ہوتا

تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا

دیا بھی تو دل کس دل آزار کو — لیا بھی تو کیا عمر بھر کا عذاب

دیر اُس نے بھی کی تو آنے میں — صبر تجھ سے بھی اے وفا نہ ہوا

تم بھی کرو نہ جبر شب و روز اس قدر — ہم بھی کرینگے صبر مگر اختیار تک

اے کہ ویرانوں میں گلزار کھلاتے ہو تم — اگلے گلزار بدل جائیں نہ ویرانوں میں

اک وہ خزاں بھی جن کی ہر رنگ بہار رہے — اک میں بہاریں بھی جو ننگ بہار ہوں

نقد بھی آخر کوئی چیز ہے — مقدر ہی دنیا میں سب کچھ نہیں

کبھی جو اس نے اجازت سوال کی دی ہے — جواب دے گئی ہے طاقت سوال مجھے

جینے والے بھی مر ہی جاتے ہیں — مرنے والوں کا نام ہوتا ہے

ذوقا صاحب کا شمار ہند و پاک کے اساتذۂ مقتدر میں کیا جاتا ہے اور وہ اس اعزاز کے بجا طور پر مستحق ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے کمال استادی اُن کے کلام سے ظاہر ہے۔ وہ قافیوں کو ایسے پہلو سے بٹھاتے ہیں کہ معنی و مفہوم کی چمک اور بڑھ جاتی ہے۔ ردیفیں اُن کے ہاں اس طرح چسپاں ہوتی ہیں کہ ان کو مکمل شعر سے الگ محسوس کرنا دشوار ہے۔ بندشوں کی چستی سے اشعار میں روانی اور جھنکار کی لہریں دوڑتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ مناسب الفاظ کا انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب اُن کے انداز کا عام جوہر ہے۔ ذیل کے چند اشعار مثال کے طور پر ملاحظہ ہوں ؎

کچھ کہہ کے جو بچاؤں بُرا سب کی نظر میں — اس سے یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کہلاؤ نہ کچھ غیر کی تعریف میں مجھ سے — سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

میں اور ترا شکوۂ جور و ستم غلط — باطل دروغ۔ جھوٹ۔ خدا کی قسم غلط

طبیعت کو مرغوب اب کچھ نہیں — سبب کیا بتاؤں سبب کچھ نہیں

خدا کے نام پہ دست و گریباں ہیں خدا والے — یہ ہے جسقدر ذکر خدا خوف خدا کم ہے

اندازۂ نشاطِ ملاقات کیجئے　　خمیازۂ نشاط مگر کچھ نہ پوچھئے

گزر جاتی ہیں راحت کی تو سو عمریں با آسانی
گھڑی بھی اک مصیبت کی بسر مشکل سے ہوتی ہے

وہ دنیا کے بھی اب کہاں رہ گئے ہیں　　جنہیں اے بتو تم نے دیں کا نہ چھوڑا

گھڑی بیمارِ غم کی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے　　اُداسی بام و در پر چھا گئی کیا تم نہ آؤ گے

ہاتھ رہ رہ کے مرے بہرِ دعا اٹھتے ہیں　　یہی اے دیکھ سہارا نظر آتا ہے مجھے

لبوں پر جانِ زار آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے　　یہ دنیا اب مجھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

اب کچھ اور اشعار جو زبان و بیان کے لحاظ سے کمالِ استادی کے مظہر ہیں ملاحظہ فرمائیں ؎

تم نے کیوں تکلیف کی تم چین سے گھر بیٹھتے　　خون اپنا ہم اگر کر بیٹھتے کر بیٹھتے

کوثر میں دُھلی ہوئی زبان کا کتنا پُر معنی۔ کتنا پُر زور اور کتنا پُر اثر شعر ہے۔ ایک ایک لفظ تاجِ کمال میں جڑا ہوا نگینہ ہے۔ ایسے آبدار اشعار کے خالق کی شاعرانہ عظمت سے کون منکر ہو سکتا ہے ؎

طبیعت کو مرغوب اب کچھ نہیں　　سبب کیا بتاؤں سبب کیوں نہیں

یہ شعر پے در پے محرومیوں اور مایوسیوں کی ایک لمبی داستان اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اور بلا کی تشریت کا حامل ہے۔ دوسرے مصرع میں "سبب کچھ نہیں" کا ٹکڑا اسو سبب کا پردہ دار ہے۔ وفا صاعیبتے "کچھ نہیں" کو کتنی صفائی اور بے ساختگی سے بہت کچھ کا ہم معنی بنا دیا ہے۔ پہلے مصرع کے لفظ "اب" میں یہ المناک حقیقت مضمر ہے کہ شعر کے متکلم کی بے دلی اور دل افسردگی درجۂ انتہا سے بھی بہت آگے نکل گئی ہے۔ یہ شعر حسنِ بیان کا ایک نادر نمونہ ہے ؎

غم سے اُن کے بھی جگر داغ داغ پائے ہیں　　دیکھنے میں جو بشر باغ باغ پائے ہیں

قافیوں کی برجستگی و شگفتگی۔ زبان کی سلاست۔ صفائی اور اندازِ بیان کی پختگی و روانی کے اعتبار سے اس شعر کو سحرِ حلال کا درجہ حاصل ہے۔ دیکھتے ہیں کسی شہر کا یا باغ یا باغ ہونا دراصل اُس غم کا پردہ ہے جس کی وجہ سے اس کا سینہ داغ داغ ہے۔ بمصداق "نانک دُکھیا سب سنسار" غمِ دوراں کی شکل میں یا غمِ جاناں کی صورت میں غم ساری دنیا پر مسلّط ہے۔ کسی کو اولاد نہ ہونے کا غم ہے تو کوئی کثرتِ اولاد سے نالاں ہے۔ کسی کو ناداری کا غم ہے تو کوئی دولت کی رکھوالی کے غم میں مبتلا ہے۔

جب وہ بُت قہرناک ہوتا ہے — پھر خدا بھی خدا نہیں ہوتا

زورِ بیان کے لحاظ سے یہ شعر اردو شاعری کے اُن شاہکاروں میں سے ایک ہے جو اپنی مثال آپ ہی ہیں۔

اس شعر میں "خدا بھی خدا نہیں ہوتا" بطور محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محبوب نے قہرناک ہونے سے ماحول پر اوسان خطا کر دینے والی دہشت طاری ہو جاتی ہے ؎

نہیں تیرے کوچے میں جینا نصیب — تو مرنے کے ہم کو ٹھکانے بہت

زبان کی صفائی اور بیان کی بے ساختگی کا سراپا فصاحت اور مجسم بلاغت شعر ہے۔

تُو ہے ہرجائی تو اپنا بھی یہی طور سہی — تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی

اسی شعر سے ملتا جلتا وفا صاحب کا بھی ایک شعر ہے ؎

کہیں جی لگانے کو جی چاہتا ہے — ترا جی جلانے کو جی چاہتا ہے!

وفا صاحب کی شاعری میں بلا کا کرب ہے۔ اور ان کی شاعری سے زیادہ ان کی زندگی کربناک ہے ان کی بے انتہا حسّاس طبیعت غم و

آلام کی آگ میں تپ کر درد و کرب کی اس کیفیت کو پہنچ گئی ہے کہ جس کا احساس مشکل ہے۔ وہ روتے نہیں۔ آہیں نہیں بھرتے۔ لیکن اُن کی خاموش بے چارگی ہزار ہا آہ و بکا کا مارفن ہے ؎

الاماں غم کے ماروں کی دنیا چلتے پھرتے مزاروں کی دنیا

غم کے مارے ہوئے لوگ زندہ تو ہوتے ہیں مگر مُردوں سے بھی بدتر۔ مُردہ بشکل زندہ کا محاورہ ایسے ہی لوگوں کے لئے وضع ہوا ہے۔ ان کو چلتے پھرتے مزاروں کا نام دینا وفا صاحب کے کمالِ جدّت بیانی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لفظ "الاماں" نے شعر کے درد و اثر کی شدّت میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے ؎

مُنہ سے سرکا دیے ہو کفن کیا جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

سرتاپا درد و اثر میں ڈوبا ہوا محاکاتی شعر ہے۔ ناممکن ہے کہ اسے سننے یا پڑھنے والا بے اختیار کلیجہ نہ تھام لے۔ مُردہ عاشق زبان حالی سے کہتا ہے جاؤ میں تم سے خفا ہو گیا ہوں خفگی کے اس اندازِ اظہار میں پیار کی جھلک تو ہے لیکن غمزدگی کا غلبہ زیادہ نمایاں ہے۔ کتنا المناک منظر ہے اور الم خیز بھی۔ لفظ "کفن" سے شعر میں شان بلاغت پیدا ہو گئی ہے۔ یہ وفا صاحب کے غیر معمولی ملکۂ تلاش کی روشن دلیل ہے۔ اس لفظ کے بغیر اس شعر کا معرضِ تخلیق میں آنا غیر ممکن تھا ؎

ہمدردی ہمدردی میں جان ہی لے کر ٹلتے ہیں
ان ظالم ہمدردوں سے جان چھڑانا سہل نہیں

وفا صاحب کی جس غزل کا یہ سوزِ مجسم اور سوز آفرین شعر ہے! اس کے سارے شعر دل سے نکلے ہوئے ہیں اور درد و اثر میں ڈوبے ہوئے ہیں ؎

دل جن کے اے وفا ہیں فسردہ مری طرح آئے گا راس کیا انہیں موسم بہار کا

موسمِ بہار عام طور پر نشاط انگیز - روح پرور اور جانفزا موسم خیال کیا جاتا ہے - اس موسم میں کیا انسان کیا حیوان کیا چرند کیا پرند سب کے سب خوش و خرم نظر آتے ہیں - لیکن خدا حافظ اُس افسردہ دل شاعر کا جس کو یہ کیف آور موسم کبھی راس نہ آسکا ہ

بس اب میں رات دن کی یہ اذیّت سہہ نہیں سکتا۔
کہ سب کچھ دیکھتا ہوں اور کچھ بھی کہہ نہیں سکتا

انسان نے انسان کو اذیت دینے کے بے شمار طریقے اختیار کر رکھے ہیں - سائنس کے اس دور ترقی میں اذیت دینے کے طریقوں میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے - محکمہ پولیس خاص طور پر ان طریقوں میں ماہر خیال کیا جاتا ہے - لیکن جس ذہنی کوفت کا اس شعر میں ذکر کیا گیا ہے وہ پولیس کے تمام طریقوں سے بھی زیادہ اذیت رساں ہے - انسان اپنی آنکھوں کے سامنے برائی دیکھے اور اُسے لب کشائی کی اجازت نہ ہو - برائی کو خاموش دیکھتے رہنا ایک حساس دل کے لئے بہت بڑا ذہنی کرب وا ذیّت ہے -

ذیل میں وفا صاحب کی ایک طویل بحر میں کہی ہوئی غزل کے چند شعر دیئے جاتے ہیں تا کہ آپ کو معلوم ہو سکے کہ حزن و ملال - اندوہ والم ، ناکامی و مایوسی وفا صاحب کی طبیعت کی افتاد ہے - ان کے اشعار سوز و گداز اور درد و غم کی تصویریں ہیں - الفاظ کا صحیح استعمال اور ان کی خاص ترتیب و ترکیب زبان میں موسیقی پیدا کر دیتی ہے - جذبات کی صداقت نے اشعار میں درد و کسک کی بجلیاں بھر دی ہیں - ان کے ہاں جذبات کا تند و تیز طوفان نہیں - ہیجان نہیں لیکن جذباتی اضطراب ہے - انہیں بیان پر عبور حاصل ہے - وہ الفاظ کے نباض ہیں

ساعتوں کی نہیں بات لمحوں کی ہے ، جسم سے رُوح پرواز کر جائے گی !
تم ہماری خبر کو تو کیا آؤ گے ، اب تمہیں کو ہماری خبر جائے گی
جس قیامت سے واعظ ڈراتا ہے تو ، اُس قیامت سے کم وہ قیامت نہیں
بارہا دل پہ گزری ہے جو ہجر میں ، بارہا جان پر جو گزر جائے گی
میرے درماں کرو میرے تن پروردہ ، جاؤ تم کس لئے نیند کھوئی کرو
ہجر کی رات لاانتہا رات ہے ، یہ قیامت نہیں جو گزر جائے گی
میرے جینے نہ جینے میں کیا فرق ہے ، میرا جینا نہ جینا برابر ہے اب
مجھ کو مرنے ہی دو مجھ کو مرنے ہی دو ، میرے مرنے سے دنیا نہ مر جائے گی
میری دنیا مری زندگی تک ہی ہے ، اور اک دن مری موت کے ساتھ ہی
خاتمہ میری دنیا کا ہو جائے گا ، میری دنیا مرے ساتھ مر جائے گی
زندگی کو نہ ہے آرزو کو بقا ، حسرت آگیں ہے دونوں کا حشر اے وفا
زندگی آرزو میں گزر جائے گی ، آرزو دل میں گھٹ گھٹ کے مر جائے گی

اِسی ضمن میں کچھ اور شعر ملاحظہ ہوں ؎

دیکھی ہیں غم کی شدتیں دیکھا ہے خونِ آرزو — اور دکھائے دیکھئے گردشِ روزگار کیا
کسی کے پاؤں پر سر رکھ دیا وفا ہم نے — بڑا ہی عرضِ تمنا میں اختصار کیا
تاریک ہی رہی مری دنیائے آرزو — بے سود ہی چراغ جلایا اُمید کا
سہتے ہیں جور و ستم جھیلتے ہیں رنج والم — یعنی کرنی ہے بسر عمر بسر ہونے تک

کسی دردمند کی ہوں صدا کسی دل جلے کی پکار ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گئی وہ بہار ہوں
بھلا مجھ پہ ڈھائیں تو ڈھائیں کیا ستم اب زمانے کی آندھیاں
میں بجھا ہوا سا چراغ ہوں میں مٹا ہوا سا غبار ہوں

کہوں کیا ہے مری زندگی یہ ہے زندگی کوئی زندگی
وہ ہے دشمن دل جاں مرا دل و جاں ہے جس پہ نثار ہوں
شب و روز لب پہ ہے لے وفا یہ دعا کہ موت ہی دے خدا
جو بھی ہے میرے نصیب میں گرا اسیر دام بلا رہوں

سیہ بختی رہی تا زندگی میرے مقدر میں
ہوا جب ختم روز ہجر شام انتظار آئی

دعا کو ہاتھ کیوں اٹھے مرے تیمار داروں کے
زباں سے کیوں نہیں کہتے کہ امید شفا کم ہے

یہ حوادث کا تواتر یہ مصائب کا ہجوم
آرزوئے زندگی جاوداں کیا کیجئے

حال مریض عشق بغیر رات بیمار عشق کی
آئیگی ہی سحر مگر فرق سحر سحر میں ہے

گھڑی بیمار غم کی آگئی کیا تم نہ آؤگے
اداسی بام و در پر چھا گئی کیا تم نہ آؤگے

وفا صاحب الفاظ کے بڑے ادا شناس اور پارکھ ہیں۔ اگرچہ الفاظ بظاہر سپاٹ اور بے جان ہوتے ہیں لیکن فنکار اپنی تخلیقی قوت سے ان میں ایک جان ڈال دیتا ہے۔ وہ ان کی حرکی قوت یعنی مفہوم۔ علامت۔ آہنگ۔ صوت اور کیفیت کو گرفت میں لاکر ان سے نئے نئے معنی و مفہوم۔ ترکیبیں و بندشیں اور استعارے وضع کرتا ہے اور موزوں الفاظ کی مدد سے حسب دلخواہ تصویریں بنا لیتا ہے۔ وفا صاحب کے اشعار کے الفاظ ملائم۔ دھیمے۔ سلیس اور سادہ ہوتے ہیں لیکن اُن کی تہ میں غضب کا جوش یا درد چھپا ہوتا ہے۔ الفاظ کی سلاست اور تراکیب کی سادگی لوگوں کو اکثر دھوکا دیتی ہے۔ وہ ان پر سے بے خبر سے گزر جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ شاعر نے ان سلیس الفاظ و معمولی تراکیب میں کیا کیا کمال بھر رکھے ہیں۔

ان کے سہل ممتنع اشعار کی چند آبدار مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

راتیں عیش و عشرت کی دن دکھ درد مصیبت کے
آتی آتی آتی ہیں جاتے جاتے جاتے ہیں

آندھیوں اور بگولوں سے کم نہیں تیرے دیوانے
خاک اڑاتے آتے ہیں خاک اڑاتے جاتے ہیں

دشمنوں کو دشمنوں سے شکوہ کیوں
دوستوں نے دوستوں سے کیا کیا

طبیعت کو مرغوب اب کچھ نہیں
سبب کیا بتاؤں سبب کچھ نہیں

روا ہو گیا ناروا ہو گیا
محبت میں جو ہو گیا ہو گیا

صبح ہوتا ہے شام ہوتا ہے
خونِ ناحق مدام ہوتا ہے

موت کو آنا ہے اک دن آئے گی
جان کو جانا ہے آخر جائے گی

تو وفا آشنا نہیں ہوتا
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اہلِ زر با خدا نہیں ہوتے
بے زروں کا خدا نہیں ہوتا

شب تیرہ ہی کیوں ہوئی بدنام
روزِ روشن میں کیا نہیں ہوتا

کس زمانے میں کیا نہ ہوتا تھا
کس زمانے میں کیا نہیں ہوتا

تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا

دیر اس نے بھی کی تو آنے میں
صبر تجھ سے بھی اے وفا نہ ہوا

محاورہ۔ استعارہ تشبیہ اور ضرب المثل کے استعمال سے زور بیان میں بےحد اضافہ ہو جاتا ہے۔ ذیل میں وفا صاحب کے چند ایسے اشعار دیئے جاتے ہیں جن میں محاورے اس خوش اسلوبی سے باندھے گئے ہیں کہ حسنِ کلام کو چار چاند لگ گئے ہیں ؎

بات کچھ دل کی تو کیا بن پائیگی
ہاں ہماری جان پر بن جائیگی

سو تو جائیگا اجل کی گود میں
آنکھ تو بیمار کی لگ جائیگی

دل نہ لے کیوں بلائیں تمہاری
دل ربا ہیں ادائیں تمہاری

تم کو دلشاد رکھے زمانہ
آئیں ٹھنڈی ہوائیں تمہاری

ہاتھ کھینچا جفا سے بھی تم نے
کس قدر بے وفا ہو گئے تم

وہ دل بھی چرا کے لے گیا ہے | گزرا جو ابھی نظر چرا کر
اُمیدِ وفا! وفا بتوں سے | اے مردِ خدا، خدا خدا کر
مجھ کو جلاتی رہی غم کی جو آگ | آخر اسی آگ نے ٹھنڈا کیا
کیا رنگ لائے وحشتِ دیوانگانِ عشق | کیا گل کھلائے دیکھئے موسم بہار کا

بھلا جس بزم میں غیروں کی کھچڑی پکتی رہتی ہو
وہاں کب اے دلِ نادان ہماری دال گلتی ہے

کہیں جی لگانے کو جی چاہتا ہے | ترا جی جلانے کو جی چاہتا ہے

ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں کہ "غزل اپنی تعمیر و ترکیب کے اعتبار سے نہایت خوشگوار امتزاج کی متقاضی ہے۔ لفظ و معنی کا حسین و لطیف پیوند۔ جذبے کی سچائی اور ذوق کی لطافت۔ خونِ جگر اور نورِ نظر کا امتزاج اور ایک خاص قسم کی نغمگی اور موسیقیت ایک اعلیٰ غزل کی خصوصیت ہے۔ غزل حسن کا ایک ایسا نمونہ ہے جس میں ایک خفیف سی بے اعتدالی ناگوار محسوس ہونے لگتی ہے۔ نہایت بے عیب تناسب اور موزونیت غزل کی ایک بنیادی صفت ہے اور اعتدال و توازن اس کی خصوصیت۔"

ایک اچھی غزل کی بڑی ظاہری خصوصیت یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ساخت کے اعتبار سے متناسب ہو۔ علمائے فن نے غزل کی ساخت میں تعداد اشعار کو معیّن اور محدود کرنے کی کوشش کی ہے اور غزل کی طوالت کو عیب قرار دیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ غزل کا جسم ایک خاص صورت رکھتا ہے جس کے حسن کے لئے ہر دوسرے جسم کی طرح تناسب کا لحاظ ضروری ہے۔ غزل کے اشعار تعداد میں جب آٹھ نو سے بڑھ جاتے ہیں تو اس کے جسم میں ڈھیلا پن۔ بے ڈھنگا پن اور پھوہڑ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اور غزل کا جسم اپنے تناسب کو

کھو بیٹھتا ہے اور غزل اپنے مرکز ثقل سے ہٹ جاتی ہے۔"

ایک اعلیٰ غزل کی جو خوبیاں اور اوصاف اوپر بیان کئے گئے ہیں مولانا نیاز فتحپوری کے مطابق وہ تمام وکمال وفا صاحب کے غزلیہ کلام کا زیور ہیں۔ مولانائے موصوف لکھتے ہیں کہ غزل کے لئے زبان کی مہارت۔ اسلوبِ بیان کی روانی۔ جذبات کی پاکیزگی۔ لب ولہجہ کی نرمی وشیرینی اور سب سے زیادہ محبت کرنے والے دل کی ضرورت ہے۔ وفا صاحب کے مختص انفاس خوشدلی سے تعبیر کریں تو یہ جسارت غالباً ناروانہ سمجھی جائے گی۔"

وفا صاحب کی غزلیں عموماً نو یا دس اشعار کی ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی غزل کی داخلی شیرازہ بندی دوسرے شعرا کی داخلی شیرازہ بندی سے بہتر ہے۔ ان کی غزل کی داخلی خوبیاں بڑی خوبصورتی سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔

وفا صاحب نے لمبی غزلیں کہنے سے ہمیشہ پرہیز کیا ہے۔ اور اگر کبھی ضرورت محسوس ہوئی ہے تو اسی بحر سب انہی ردیف اور قافیوں سے دو غزلہ۔ سہ غزلہ بلکہ چہار غزلہ تک بھی کہے ہیں۔ لیکن ان کے اشعار آٹھ نو سے متجاوز نہیں ہوئے۔ انہوں نے کئی غزلیں بے عطف واضافت بھی کہی ہیں۔ یہ سب کچھ ان کی استادی اور قادر الکلامی کی روشن دلیل ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ پر ان کو پوری گرفت حاصل ہے۔ الفاظ ان کے ہاتھ میں مختلف مطالب بیان کرتے وقت آپ سے آپ موزوں شکل میں ڈھلتے جاتے ہیں۔ اور بعض اوقات تو وہ انہی آٹھ دس لفظوں کے پھیر بدل سے ایک ایسی مرصع اور تابدار غزل کہہ دیتے ہیں کہ قارئین وسامعین حیران وششدر رہ جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے انہیں الفاظ کا جادوگر کہا جا سکتا ہے۔ آوازِ محبت۔ آغازِ محبت۔ سازِ محبت ردیف اور قافیے

میں نو نو شعر کی چار غزلیں کہی ہیں اور ان میں سے دو بقید یک قافیہ ہیں۔
نمونتاً بقید یک قافیہ ایک غزل درج ذیل ہے ؎

برسوں سے ہوں میں زمزمہ پرواز محبت
آئی نہ جوابا کبھی آواز محبت

اک درد محبت ہے مری ہر رگ و پے میں
ہر سانس ہے میرا اب اک آواز محبت

ہر چند کہ ہر بزم میں ٹھکرائی گئی ہے
آواز محبت ہے پھر آواز محبت

دن رات کسی درد بھرے دل کی لگن میں
آوارہ آفاق ہے آواز محبت

معمور ہیں آواز محبت سے فضائیں
مستور ہے گو صاحب آواز محبت

آجائے ذرا سینۂ آفاق میں گرمی
ہو جائے ذرا شعلہ زن آواز محبت

یہ دور ہے دور ہوس اس دور میں لے دل
سنتا نہیں دل سے کوئی آواز محبت

جس شخص کے سینے میں ہے دل کی جگہ پتھر
سمجھے گا وہ کیا معنیٔ آواز محبت

اس دور تنگ و دو میں وفا کون سنے گا
کتنی ہی دلاویز ہو آواز محبت

ایک اور غزل بے عطف و اضافت اور بقید یک قافیہ نمونے کے طور پر
درج ذیل ہے ؎

نہیں نہیں نہیں اب وہ پلٹ کے آنے کا
زمانے والوں میں چرچا ہے جس زمانے کا

نہیں نہیں وہ نہیں جس کا خواب دیکھا تھا
کچھ اور رنگ ہے بدلے ہوئے زمانے کا

ہمہ غرور، سراپا فتور، محض فجور
خدا سے دور ہے انسان اس زمانے کا

تری فضول سرائی سے اٹھتا ہے یہ سوال
کہ تو عجوبہ ہے اے شیخ کس زمانے کا

مرے ترانے میں ہے تان ہر زمانے کی
مرا ترانہ ترانہ ہے ہر زمانے کا

رہیں گے ہو کے زمانے کی بے رخی کا شکار
جو لوگ رخ نہیں پہچانتے زمانے کا

نہ اس لئے ہو وفا کے کمال سے منکر
کہ یہ غریب ہے شاعر ترے زمانے کا

ساتواں باب

اُستاد کی اِصلاحیں

شعر	اک عمر کٹ چلی ہے ترے ساتھ اے رفیق	افسوس ہے کہ تو کبھی سمجھا نہیں مجھے
اصلاح	اک عمر سے ہے مجھ سے ترا ساتھ اے رفیق	الخ
شعر	بیہوش ہو کے سو گئی ہے ساری انجمن	ہوگا نہ کوئی تا بہ سحر ہوشیار اب
اصلاح	الخ	ہوگا نہ حشر تک بھی کوئی ہوشیار اب
شعر	یہی جی میں آتا ہے دن رات مضطر	کہ پڑ رہیے اُس در پہ معذور ہو کر
اصلاح	الخ	پڑے رہیئے اُس در پہ معذور ہو کر
شعر	ہو جائے گا کسی نہ کسی سے کوئی خطا	عریاں نہ کر شباب زمانہ خراب ہے
اصلاح	پڑ جائیگی کسی نہ کسی کی بری نظر	الخ
شعر	ترے مضطر کا ہے عجیب احوال	شادماں بھی نہیں حزیں بھی نہیں
اصلاح	ہے عجب حال تیرے مضطر کا	الخ
شعر	جس نے یہ درد دیا ہے وہ دوا بھی دیگا	ڈھونڈ مت دردِ محبت کی دوا اور کہیں
اصلاح	الخ	نہیں اس درد کی دنیا میں دوا اور کہیں
شعر	بڑھے جسقدر علم و حکمت زیادہ	گھٹی اور اپنی عقیدت زیادہ
اصلاح	الخ	گھٹی اور حق سے عقیدت زیادہ
شعر	ڈالو نہ ہم کو کشمکشِ انتظار میں	جھوٹا نہ ہم سے وعدۂ فردا کرے کوئی
اصلاح	ڈالے نہ ہم کو کشمکشِ انتظار میں	الخ

شعر	کس کو تھا معلوم اک دن یوں خزاں بن جائیگی	زندگی جس کو بہارِ جاوداں سمجھا تھا میں
اصلاح	کس کو تھا معلوم پامالِ خزاں ہو جائیگی	الخ
شعر	اور ہی تصویر تھی ہر ذہن میں	ہر نظر میں تیرا نقشہ اور تھا
اصلاح	اور ہے ہر ذہن میں صورت تری	الخ
شعر	یوں دیکھنے کو ہیں گل خوشرنگ سب حسیں	لیکن یہ گل ہیں جنمیں محبت کی بو نہیں
اصلاح	یوں دیکھنے کو ہیں گل خوشرنگ ہر حسیں	لیکن کسی میں کچھ بھی محبت کی بو نہیں
شعر	وعدے پر آنے کو تو وہ آ گئے	آ گئے ۔ بہلا گئے ۔ تڑپا گئے
اصلاح	الخ	آئے بہلانے کو اور تڑپا گئے
شعر	زباں کھل نہ سکی چشمِ اشکبار کے بعد	کلام ختم ہوا سب اس اختصار کے بعد
اصلاح	الخ	بیاں ختم ہوا سب اس اختصار کے بعد
شعر	دلِ ناداں سمجھتا تھا بہت آسان منزل کو	سفر الفت کا لیکن ایک مشکل امتحاں نکلا
اصلاح	الخ	سفر الفت کا لیکن سخت مشکل امتحاں نکلا
شعر	ٹھہرو کچھ وقت اور کہ اے دوستو ابھی	حالات سازگار ہمارے لئے نہیں
اصلاح	کچھ وقت اور ٹھہرو کہ اے دوستو ابھی	الخ
شعر	جو آج اجڑا ہے گلشن تو غم نہیں مضطر	دکھائی دیگا یہ کل ہی ہرا بھرا تجھ کو
اصلاح	جو آج اجڑا ہے گلشن تو غم ہی کیا مضطر	دکھائی دیگا یہ کل پھر ہرا بھرا تجھ کو
شعر	یہ مثل مشہور ہے جیسا کہو ویسا سنو	یہ بھی ہے کچھ ٹھیک ہی جیسا سنو ویسا کہو
اصلاح	الخ	اور یہ بھی ٹھیک ہے، جیسا سنو ویسا کہو
شعر	بات کرنیکا سلیقہ جنہیں خود نہ آیا	بات کرنے کا سکھاتے ہیں سلیقہ مجھ کو
اصلاح	بات کرنیکا نہ خود جن کو سلیقہ آیا	الخ
شعر	زمانے کے تغیر سے نہ کوئی بچ سکا مضطر	زمانہ رہ نہیں سکتا ہمیشہ ایک حالت پر

اصلاح زمانے کے تغیر کا گلہ بے کار ہے منظر — الخ

شعر آنکھیں چرا کے تم جو سرِ راہ گزر گئے — وہم و گماں ہزار مرے دل پہ بھر گئے

اصلاح آنکھیں چرا کے پاس سے جب تم گزر گئے — الخ

شعر اُسی دنیا سے کیا مانگوں مرادیں — جو دنیا ہیچ ہے میری نظر میں

اصلاح میں اُس دنیا سے رکھوں کیا توقع — الخ

شعر چمن میں نت شگوفے چٹکتے رہے — بسے اور اُجڑے کئی آشیانے

اصلاح نئے شگوفے چٹکتے رہے گلستاں میں — الخ

شعر نہ چھیڑ اے ندیم آج پھر وہ کہانی — چھما چھم برستا ہے آنکھوں سے پانی

اصلاح نہ چھیڑ اے ندیم آج غم کی کہانی — الخ

شعر ہو جائے نہ بدنام رہ و رسمِ محبت — نکلے نہ ترے لب سے کہیں آہ و فغاں دیکھ

اصلاح الخ — آئے نہ ترے لب پہ کہیں آہ و فغاں دیکھ

شعر جو تیرے جور کی یوں ہی رہی فراوانی — وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں

اصلاح یونہی رہی جو ترے جور کی فراوانی — الخ

شعر آج ان سے صبح دم جو ملاقات ہو گئی — سمجھو خدا کی کوئی کرامات ہو گئی

اصلاح آج ان سے دفعتہً جو ملاقات ہو گئی — الخ

شعر نگاہ مست کے ساغر پلا دیئے تو نے — جو ہوشمند تھے بے خود بنا دیئے تو نے

اصلاح نگاہ مست سے ساغر پلا دیئے تو نے — الخ

شعر دیکھ سکتا ہے اگر تو وقت کے آثار دیکھ — آنے والے دور کے بگڑے ہوئے اطوار دیکھ

اصلاح دیکھ سکتا ہے اگر تو وقت کے اطوار دیکھ — چشمِ دل سے آنے والے دور کے آثار دیکھ

شعر بندے کسی کا ذکر ہی کیا ہے مرے قریب — اللہ سے بھی مانگنا ذلت سے کم نہیں

اصلاح اے ہمنشیں مجھے کسی بندے سے ہو تو کیا — الخ

شعر — شکرِ نعمت نہ کر سکا ہیں ہی — تیرے ہوتے رہے مگر احساں

اصلاح — شکرِ نعمت مجھی سے ہو نہ سکا — الخ

شعر — جمالِ یار کے جلوؤں کی تاب لا نہ سکے — ہزار شوق تھا دل میں نظر اٹھا نہ سکے

اصلاح — جمالِ یار کے جلوے کی تاب لا نہ سکے — ہزار شوق پہ بھی ہم نظر اٹھا نہ سکے

شعر — بے ربط سا فسانۂ ہستی ہے کیا کہوں — کچھ ابتدا کی یاد ہے نہ انتہا کی یاد

اصلاح — بے ربط ہے فسانۂ ہستی سناؤں کیا۔ — الخ

شعر — تقدیر پر ہزاروں ہی الزام آ گئے — تدبیر کوئی جب نہ مری کارگر ہوئی

اصلاح — ناچار میں بھی قائل تقدیر ہو گیا — تدبیر جب نہ کوئی مری کارگر ہوئی

شعر — ہر چند تجھ کو گردشِ دوراں کا ہے گلہ — واجب ہے پھر بھی شکر ہی پروردگار کا

اصلاح — ہر چند تو ہے گردشِ دوراں سے پائمال — لازم ہے پھر بھی شکر ہی پروردگار کا

شعر — محو دنیا ہی کے دھندوں میں ہیں کچھ ایسے — عاقبت کو نہ کسی وقت سنوارا ہم نے

اصلاح — الخ — عاقبت کو نہ کسی طور سنوارا ہم نے

شعر — دیکھئے وصل و ملاقات میں گزرے کیوں کر — وقت یہ اور بھی مشکل ہے خدا خیر کرے

اصلاح — دیکھئے وقت ملاقات کا گزرے کیوں کر — الخ

شعر — میری سنو اگر تو محبت نہ کیجئے — جاں کو رہیں درد و اذیت نہ کیجئے

اصلاح — میری جو مانیئے تو محبت نہ کیجئے — دل کو رہینِ درد و اذیت نہ کیجئے

شعر — واعظ یہ بات کوئی ترے طعن کو نہیں — ملتے ہیں سیکڑوں میں کئی یار سا مجھے

اصلاح — واعظ یہ تجھ پہ طعن نہیں میں کہوں اگر — الخ

شعر — یہ مانا قطرہ و دریا ہیں اپنی اصل میں دونوں — کبھی قطرہ بھی ہو سکتا ہے دریا ہم نہ مانیں گے

اصلاح — الخ — مگر قطرہ بھی ہو سکتا ہے دریا ہم نہ مانیں گے

شعر — ہر زمانے میں تھا کیا ایسا ہی اس دنیا کا حال — محو حیرت ہوں خدایا تیری دنیا دیکھ کر

ہنر زمانے میں تھا گیا ایسا ہی دُنیا کا چلن

تری ہمت میں کمی رہ گئی ہوگی کمی ورنہ

الخ

ڈھونڈتا پھرتا ہوں صدائیں سید دل کی کو بکو

ڈھونڈتا پھرتا ہوں درد دل کا درماں کو بکو

منکر ذات میں نہیں مضطر

الخ

اگرچہ رندوں سے صحبت رہی مجھے مضطر

اگرچہ رندوں سے یاری رہی بہت مضطر

گلہ کرتے رہے غیروں پہ ہم اپنی تباہی کا

گلہ کرتے رہے غیروں کا ہم اپنی تباہی پر

ہوتا ہو جس کے ہاتھ سے انسانیت کا خون

انسانیت کا خون ہو جس کے حصول میں

بجھ گئے سب دیئے اُمیدوں کے

الخ

مرے ملنے کو نگہ لیے وہ غفلت شعار آیا

زہے قسمت ہمارے گھر تو اے جانِ شباب آیا

جتنا ممکن تھا کیا اس کا طبیبوں نے علاج

الخ

جس نے لالہ و گل کو شگفتگی دیدی

الخ

الخ

کوئی ایسا نہیں جو کام مضطر ہو نہیں سکتا

نہیں کوئی بھی کام ایسا جو مضطر ہو نہیں سکتا

مل ہی جائیگا کبھی کوئی مسیحا ایک دن

الخ

زہد اپنا شعار نہ ہو سکا

زہد میرا شعار ہو نہ سکا

میں رند بن نہ سکا بادہ خوار ہو نہ سکا

الخ

جو دیکھا تو پس پردا کوئی اک مہرباں نکلا

جو دیکھا تو پس پردا کوئی اپنا مہرباں نکلا

مجھ کو وہ باحشمت و ثروت نہیں قبول

مجھ کو تو عز و جاہ و حشمت نہیں قبول

اب کہیں روشنی نہیں ہوتی

دل میں اب روشنی نہیں ہوتی

کدھر سے چاند نکلا آج کیسا انقلاب آیا

الخ

پھر کبھی راضی ترا بیمار نہ ہونے پایا

پھر کبھی اچھا ترا بیمار نہ ہونے پایا

اُسی نے میرے کبھی دل کو فسردگی دیدی

اُسی نے مجھ کو قیامت کی بیدلی دیدی

اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح
شعر
اصلاح

شعر	خودی کو مار کے اُلفت کو خوار کون کرے	اب ان سے عرضِ کرم بار بار کون کرے
اصلاح	الخ	کسی سے عرضِ کرم بار بار کون کرے
شعر	پیتے ہو تم اگر تو چھپاتے ہو کس لئے	مضطر گنہ کا عذر ہے بدتر گناہ سے
اصلاح	الخ	عذرِ گناہ بدتر ہے مضطر گناہ سے
شعر	ہیں کم ہی کسی کو ملے دو جہاں	کہ دُنیا ملی ہے تو عقبےٰ نہیں
اصلاح	کسی کو ملے شاذ ہی دو جہاں	جو دنیا ملی ہے تو عقبےٰ نہیں
شعر	سرور و مستی میں تجھ سے لپٹ نہ جاؤں کہیں	مجھے نہ پیار سے دیکھا کرو خدا کیلئے
اصلاح	سرورِ کیف میں تجھ سے لپٹ نہ جاؤں کہیں	الخ
شعر	بڑھاپے میں سب ٹھیک ہو جائیگا	جوانی میں کر لیجئے جو کچھ خطائیں !
اصلاح	بڑھاپے میں ہو جائیگا ٹھیک سب کچھ	الخ
شعر	کوئی بلبل کو سمجھا دے کہ خالق کی نگاہ میں	گلوں کا بھی وہی رتبہ ہے جو درجہ ہے خاروں کا
اصلاح	الخ	گلوں سے کم نہیں درجہ کسی پہلو سے خاروں کا
شعر	تیرگی ہی تیرگی ہے دیر ہو یا کہ حرم	سخت مشکل ہے کہاں جاؤں الٰہی کیا کروں
اصلاح	دیر میں بھی تیرگی ہے کعبہ میں بھی تیرگی	الخ
شعر	اگرچہ باعثِ تشویش ہی جو ہو رہا ہے آج	مگر صبر و سکون سے رنگِ دنیا دیکھتے جاؤ
اصلاح	یہ مانا ہو رہا ہے جو وہ دیکھا جا نہیں سکتا	الخ
شعر	اُٹھا راہِ وفا میں ہر اِک قدم غلط	ابتک اسی خطا کی سزا پا رہا ہوں میں
اصلاح	اُٹھا تھا راہِ عشق میں بس اک قدم غلط	الخ
شعر	سفرِ حیات کا تیزی سے ختم ہونا گیا !	قریب آگیا وقت اس جہاں سے رخصت کا
اصلاح	سفرِ حیات کا تیزی سے ختم ہونے لگا	الخ
شعر	جانے کیا بات تھی مضطر صاحب	ہم کو کل آپ بہت یاد آئے

اصلاح		الخ		کل ہمیں آپ بہت یاد آئے

شعر		پھولوں میں اب نہ رنگ رہا اور نہ بُو رہی		یہ کون رشکِ باغ گیا آکے باغ سے

اصلاح		پھولوں میں اب نہ رنگ کہیں ہے نہ بُو کہیں		الخ

مندرجہ بالا مثالوں کے علاوہ اب میں ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لئے ذیل میں کچھ ایسی اصلاحیں دے رہا ہوں جن کا تعلق وفا صاحب کے بے تکلف دوستوں اور چند مقتدر معاصرین سے ہے۔ خیال رہے کہ ایسا کرنے میں کسی صاحبِ کمال کی عظمت پر حرف گیری یا تنقیص مقصود نہیں بلکہ صرف وفا صاحب کی سخن شناسی۔ باریک بینی۔ نکتہ دانی اور تنقیدی شعور کا اُجاگر کرنا مدِ نظر ہے۔

مولانا تاجور		خدا مجھ کو تجھ سے ہی محروم کردے
		جو کچھ اور تیرے سوا چاہتا ہوں

وفا صاحب		تجھی سے خدا مجھ کو محروم کردے		الخ

سلام مچھلی شہری		کل تو خیر ان کی یاد آئی تھی !
		آج کیوں ہے فضا اُداس اُداس

وفا صاحب		کل تو خیر اُن کا وقت رخصت تھا		الخ

کرپال سنگھ بیدار		یہ بے حجابی کی دھوم برحق مگر وہ پردے بھی کوئی دیکھے
		جو اپنے رُخ سے اُٹھا کے تم نے مری نظر پہ گرا دیئے ہیں

وفا صاحب		یہ بے حجابی . . . .
		جو رُخ سے پردہ اُٹھا کے تم نے مری نظر پہ گرا دیئے ہیں

جگر مراد آبادی		ہیچ ہے اور جگر اسی مُنہ سے ؛ پی پلا کر برائیاں توبہ

وفا صاحب		شیخ جی یہ صفائیاں توبہ ؛		الخ

اقبال	ترے عشق کی انتہا چاہتا ہوں !
	مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں !
وفا صاحب	وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں ! الخ
حفیظ جالندہری	بہت آغاز دیکھے ہیں بہت انجام دیکھے ہیں
	کئی عبرت کے نقشے ہیں مری اس چشمِ حیراں میں
وفا صاحب	بہت آغاز ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
	بہت نقشے ترے اے گردشِ ایام دیکھے ہیں

آٹھواں باب

آئینۂ سخن!

(۱)

اگرچہ پنجاب اور دوسرے صوبوں میں اُردو کو سرکاری سرپرستی سے محروم کر دیا گیا ہے لیکن اُردو شاعری سے عوام کی دلچسپی میں کمی نہیں آئی۔ بلکہ روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو کے منظومات دیوناگری اور گورمکھی حروف میں بھی کثرت سے شائع ہو رہے ہیں۔ اور ہاتھوں ہاتھ بک رہے ہیں۔ اردو شاعری کی یہ ہمہ گیر مقبولیت اور اُردو رسم الخط نہ جاننے والوں میں اردو کے سخن مشتاقوں کی روز افزوں تعداد کثیر اردو زبان کے مستقبل کی حوصلہ افزا ضمانت ہے۔ سخن مشتاقی کی اس لہر کو صحیح راستے پر ڈالنے اور زیادہ سے زیادہ وسعت دینے کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ سخن مشتاقوں کو شعری اغلاط کا علم کرایا جائے اور سخن گو اصحاب کو ان اغلاط سے بچایا جائے "جان نثار" کے شمارہ نمبر۱۸ سے عنوان بالا کے تحت یہ سلسلہ مضامین اسی مقصد سے شروع کیا جا رہا ہے۔

اغلاط کی وضاحت کے لئے قصداً جیّد اور مسلم الثبوت اُستادوں کے کلام سے مثالیں لی گئی ہیں کیونکہ صف دوئم کے تخلیقات یہ کام نہیں دے سکتے۔ اس ضمن میں یہ گزارش کر دینا مناسب ہے کہ خدا کے سوا اور کسی کی ذات اغلاط سے مبرّا نہیں۔ یہ کلیہ دوسرے انسانوں کی طرح اردو کے شعر گو

اصحاب پر بھی اطلاق پذیر ہوتا ہے۔ عام شعرا کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ بڑے بڑے استادوں سے بھی کبھی کبھی کوئی غلطی سرزد ہو ہی جاتی ہے۔ لیکن ایسی چند غلطیوں کی وجہ سے ان کی شاعرانہ عظمت میں فرق نہیں آسکتا۔ ان غلطیوں کی بنا پر ان کی عظمت سے انکار کرنا بہت بڑا اور ناقابل عفو گناہ ہے۔

اس گزارش کے بعد بھی اس خیال سے کہ خالص علمی و فنی نوعیت کی یہ بحث ہر قسم کی تلخی سے پاک رہے زندہ استادوں کے ارشادات کو زیر تنقید لانے کی جسارت نہیں کی جا رہی اور مطلوبہ حوالہ جات کے لئے صرف خلد آشیانی استادوں کے اشعار سے سروکار رکھا گیا ہے۔ جن کی مقدس روحوں کو خراجِ عقیدت ادا کرنا ہم سب کا فرض ہے۔

خدائے سخن میر تقی میر کا شعر ہے ؎

سردی اب کے برس ہے اتنی شدید
صبح نکلے ہے کانپتا خورشید

سورج اربوں مربع میل پھیلا ہوا ہے انتہا حرارت کا سرچشمہ ہے اور پتھروں کو پگھلا دینے والی آگ سے بھی ہزاروں لاکھوں گنا گرم ہے۔ جاڑے کے دنوں میں طلوع ہوتے وقت اس کے کانپنے کو سردی کی شدت سے تعبیر کرنا قابل داد شاعرانہ استدلال ہے۔ لیکن شعر کے پہلے مصرع کا ٹکڑا "اب کے برس" ذوق سلیم کو کھٹکتا ہے۔ جاڑے کے دنوں میں سورج کا کانپتے ہوئے طلوع ہونا ہر برس کا معمول ہے نہ کہ صرف اس برس کا جس کے موسم سرما کی شدت میر صاحب نے بیان فرمائی ہے۔

مرزا محمد رفیع سودا کا شعر ہے ؎

دل مت ٹپک نظر سے کہ پایا نہ جائیگا
جوں اشک پھر زمیں سے اُٹھایا نہ جائیگا

آنسو کا آنکھ سے ٹپکنا تو درست ہے مگر دل کا نظر سے ٹپکنا محاورہ زبان کے منافی ہے۔ ٹپکنا کے معنی ہیں خود بخود گر پڑنا۔ مگر خود بخود نظر سے نہیں گرتا بلکہ گرایا جاتا ہے۔ اس کا نظر سے گرنا بھی غیر ارادی ہوتا ہے یعنی گرائے جانا کا ہم معنی۔ اس کے علاوہ آنسو کا آنکھ سے ٹپکنا جسمانی عمل ہے۔ اس لئے دل کے نظر سے ٹپکنے کی مثال نہیں ہو سکتا۔ آنسو زمین پر ٹپک کر خاک میں مل جاتا ہے اور جسمانی طور پر نابود ہو جاتا ہے۔ دل جسمانی طور پر نظر سے نہیں گرتا۔ اس لئے اس کے نابود ہو جانے یا سلامت رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نظر بریں دل کے آنسو کے انجام سے عبرت پذیر ہونے اور ٹپکنے سے باز رہنے کی تلقین کرنا بے کار سی بات ہے۔ مصرع اول میں لفظ "دل" سے پہلے حرف ندا (اے) نہ ہونے سے ضعفِ بیان کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔ یہاں اے دل کی بجائے صرف دل کہنا عجزِ طبع کی دلیل ہے ؎

پھرتا ہے بیل حوادث سے کہیں مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں — ذوقؔ

شعر کے پہلے مصرع میں جو دعویٰ کیا گیا ہے اس کا ثبوت دوسرے مصرع میں مہیا کرنے میں صاحبِ شعر کامیاب نہیں ہوا۔ شیر کی طاقت ضرب المثال ہے اور بے خوفی جسے مردانگی کا نام دیا جاتا ہے اس کی فطرت کا جزو ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے۔ کہ اگر دریا کو تیر کر پار کرتے ہوئے اس کا رخ پانی کے بہاؤ کی تیزی سے کہیں ذرا بھی ترچھا ہو جائے تو وہ وہیں سے

واپس لوٹ جاتا ہے اور نئے سرے سے سیدھا تیر کر دوسرے کنارے پہنچتا ہے۔ زور شور سے بہتے ہوئے گہرے پانی والے دریا کو سیدھا تیر کر پار کرنا بلا شبہ طاقتوری و مردانگی کا بیّن ثبوت ہے۔ لیکن اس شعر کا دوسرا مصرع ایسے دریا کے ذکر سے خالی ہے۔ محض آب کا لفظ ایسے دریا کا ہم معنی نہیں ہو سکتا۔

اس مصرع میں وقتِ رفتن کا ٹکڑا بھی بے ضرورت ہے اور محض قافیہ کی شرط پوری کرنے کے لئے بہ مجبوری برائے بیت استعمال کیا گیا ہے۔ سادہ الفاظ میں اس مصرع کی نثر کی جائے تو مہمل اور بے ہنگم سا یہ فقرہ بنے گا۔

شیر پانی میں چلتے وقت سیدھا تیرتا ہے۔ چلنا اور تیرنا الگ الگ نوعیت کے دو مختلف فعل ہیں جو بیک وقت معرضِ ارتکاب میں نہیں آسکتے۔ یعنی جو چل رہا ہے وہ تیر نہیں رہا ہوتا اور جو تیر رہا ہو وہ چل رہا نہیں ہوتا ہے

نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات اگر بات بنائے نہ بنے (غالبؔ)

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ محبوب نکتہ چینی کا عادی ہے۔ بات بات پر ٹوکتا ہے اور ہر بات ردّ کر دیتا ہے۔ اس لئے کوئی بات نہیں بن پڑتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کے سامنے غمِ دل بیان کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ شعر میں ردیف قافیہ کی برجستگی اور الفاظ کا حسین تکرار نہایت دلاویز اور لائقِ تحسین ہے۔ غزل کے اگلے شعر میں بھی یہ خوبی بڑی کامیابی کے ساتھ قائم رکھی گئی ہے۔ مگر زیر بحث شعر کے پہلے مصرع میں خفیفی فاعل

کا واضح نہ ہونا شعر میں الجھاؤ پیدا کر رہا ہے اور مصرع پڑھنے سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ نکتہ چیں غمِ دل ہے محبوب نہیں۔ غالبؔ کے شعر میں ترمیم کی جسارت کرنا چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہے۔ لیکن اس میں جو سقم ہے اس کی عملی وضاحت کے طور پر یہ سمجھاؤ دینے میں کوئی حرج نہیں کہ پہلا مصرع کچھ اس طرح ہو سکتا ہے۔ ع

"نکتہ چیں ہے اسے حالِ دل سنائے نہ بنے"

غالبؔ کا یہ شعر بھی اسی قسم کی معیوب و نامرغوب پیچیدہ بیانی کا نمونہ ہے ۔

اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ وقتِ دفن
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں

عیب تعقید یعنی شعر میں کسی لفظ کا اپنی جگہ پر نہ ہونا شعر کے حُسن کو زائل کر دیتا ہے۔ لیکن یہ شعر پہلے مصرع میں اس عیب کی وجہ سے بالکل بے معنی اور مضحکہ خیز ہو گیا ہے۔ شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ کفن کے اندر میرے پاؤں خود بخود ہل رہے ہیں۔ مگر لفظ میرے اپنی جگہ پر نہ ہونے کے باعث مصرع کے معنی یہ ہو گئے ہیں میرے اندر کفن کے پاؤں ہل رہے ہیں۔

ایسی مضحکہ خیز تعقید کی مثال ڈاکٹر اقبالؔ کے ایک شعر کا یہ مصرع ہے۔ ع

"ڈالی گئی جو فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ"

اس مصرع کی نثر اس طرح ہو گی "جو ڈالی فصلِ خزاں میں شجر سے ٹوٹ گئی" مصرع میں لفظ "گئی" اپنی جگہ پر نہیں اور لفظ ٹوٹ کے بعد کی بجائے ڈالی کے بعد آیا ہے۔ اس سے مصرع مہمل ہو گیا ہے۔

میر حسنؔ کی مثنوی بدرِ منیر کے شعر ۔

گئے وجد میں آشجر اور حجر
درختوں سے گرنے لگے جانور

کا پہلا مصرع ایسی ہی تعقید کا حامل ہونے کے باوجود مہمل نہیں۔ اقبال بھی یوں کہہ کر اہمال سے بچ سکتا تھا۔ ع

فصلِ خزاں میں شاخ گئی جو شجر سے ٹوٹ

(۲)

غالب کا مشہور شعر ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب
جو لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

شعر کا مضمون بہت خوب ہے اور ایک مسلمہ حقیقت کا حامل بھی۔ مگر اس کے پہلے مصرع میں لفظ "ہے" اپنے مقام پر نہیں۔ یہ مصرع دو مختلف معانی ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ایک ٹکڑا ہے 'عشق پر زور نہیں' اور دوسرا ہے 'یہ وہ آتش غالب' لیکن سننے والے کو تھوڑی دیر کے لئے ہی سہی سرسری طور پر یہ شبہ ہونا ممکن ہے کہ دوسرے ٹکڑے کا لفظ 'ہے' پہلے ٹکڑے کے لفظ 'نہیں' سے وابستہ ہے۔ اور یہ بھی خارج از امکان نہیں کہ اس شعر کا سنانے والا اپنی روانی میں ... 'عشق پر زور نہیں' کے بعد خفیف سا وقفہ دیئے بغیر 'عشق پر زور نہیں ہے' پڑھ جائے۔ نظر بریں فصاحت کا تقاضہ یہ تھا کہ 'نہیں' اور 'ہے' کے درمیان کچھ فاصلہ واقع ہو جاتا۔ مثلاً یوں۔ ع

عشق پر زور نہیں یہ ہے وہ آتش غالب

مغالطہ پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ 'نہیں' کے معنی وہی ہیں جو 'نہیں ہے' کے ہیں اور غالب کا تعلق اس طبقہ سے نہیں جو پوری سختی سے اس نظریے کا حامی

ہے کہ جب لفظ "نہیں" میں "ہے" کا مفہوم شامل ہے تو اس لفظ کے بعد "ہے" استعمال کرنا غیر ضروری ہے۔ غالب کے کلام میں ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں "نہیں ہے" کو "نہیں" کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ مثلاً ؎

نالہ پابندِ نے نہیں ہے — رونے کی کوئی لے نہیں ہے

آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے — طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

پہلے مصرع میں لفظ "ہے" اپنے مقام پر نہ ہونا جو الجھاؤ پیدا کر رہا ہے اس سے بھی زیادہ اہم اعتراض اس شعر پر یہ ہے کہ محاورۂ زبان آگ لگانا ہے۔ آتش لگانا نہیں۔ یہ اعتراض مصرع کے "بڑے ٹکڑے" "ہے یہ وہ آتش غالب" الفاظ کی ترتیب بدل کر "یہ ہے وہ آتش غالب" کر دینے کے بعد بھی قائم رہتا ہے۔ اس اعتراض کی وضاحت کی غرض سے پورا مصرع یوں بدلا جا سکتا ہے، ع

'عشق پر زور نہیں یہ ہے وہ آگ لے غالب'

داغ کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے ؎

بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں
کسی سے آج بگڑی ہے جو وہ یوں بن کے بیٹھے ہیں

پہلے مصرع کے دو ٹکڑوں میں الفاظ "تنتی ہیں" اور "تن کے بیٹھے ہیں" دامن فصاحت کو داغی بنا رہے ہیں۔ یہ مصرع پڑھنے سے محبوب کی غضب ناکی کا ہیبت خیز نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ہاتھ میں خنجر لئے بیٹھا کیوں رہا ہے اور جس کسی سے اس کا بگاڑ ہو گیا ہے اس پر حملہ کرنے کے لئے دوڑ کیوں نہیں پڑا۔ خنجر بدست تن کے بیٹھ جانے کا مطلب تو یہ ہے کہ جس سے بگاڑ ہو گیا ہے وہ حملہ کرنے آئے تو ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے مصرع میں "بگڑی ہے" کے بعد "تن کے بیٹھے ہیں" کہہ کر رعایت لفظی پیدا کی گئی ہے۔

لیکن سارے مصرع کے مفہوم پر غور کیا جائے تو یہ رعایت نامرغوب معلوم ہوتی ہے۔ لفظ "بوں" نے اس رعایت کی نامرغوبیت کو اور بھی نمایاں کر دیا ہے۔

امیر مینائی نے داغ کی اس غزل پر بڑی پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ اور اپنی غزل کے مقطع میں کہا ہے ؎

امیر اچھی غزل ہے داغ کی جس کا یہ مصرع ہے
بھویں تنتی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں

مگر بحوالہ داغ کے اس مصرع کی تضمین کرنا ظاہر کرتا ہے کہ پسندیدگی کا یہ اظہار رسمی نوعیت کے معاصرانہ اعتراف سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ بعض نقاد یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ امیر مینائی نے اس مصرع کی تضمین کر کے داغ پر مرموز چوٹ کی ہے۔ خود امیر مینائی نے جو اس مصرع پر گرہ لگائی ہے وہ کسی قدر سقیم ہے۔ "جس کا یہ مصرع ہے" کی بجائے "جس کا مصرع یہ ہے" ہونا چاہیئے تھا۔

داغ اپنے دور کا سب سے بڑا اور مقبول ترین غزل گو شاعر تھا مگر اس زمین میں اس کے ایک استاد بھائی ذوق کے شاگرد ظہیر کا مطلع خوب اور لطف زبان و زور بیان کا نہایت ہی بلیغ نمونہ ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

جبیں ہے پُرشکن ابرو پہ بل ہے تن کے بیٹھے ہیں
بڑی منت سماجت سے وہ اتنے مَن کے بیٹھے ہیں

پہلے مصرع میں محبوب کی غضب ناکی کا نقشہ بڑے دلکش الفاظ اور بدرجۂ کمال موثر انداز میں کھینچا گیا ہے۔ دوسرے مصرع میں اس عالم کو من کر بیٹھنے سے تعبیر کر کے اس امر کا اندازہ کرنا قارئین پر چھوڑ دیا ہے کہ اگر محبوب کے من کر بیٹھنے کا یہ عالم ہے تو غصے کا عالم کیا ہوگا۔ "بڑی منت سماجت سے" کے ٹکڑے نے شعر کو اور بھی جاندار بنا دیا ہے۔

امیر مینائی نے داغ کی ساری غزل کو قابلِ تعریف قرار دیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس غزل میں صرف ذیل کا ایک شعر ایسا ہے جو محتاج تعریف نہیں ہے

بہت رویا ہوں جب سے میں نے یہ اک خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں

دشمن سے مراد رقیب ہے۔ عاشقِ صادق کے لئے اس سے بڑھ کر رونے اور آہ و فغاں کرنے کی اور کوئی بات نہیں ہو سکتی کہ اس کا محبوب رقیب کو منانے کی کوشش میں آنسو بہانے پر مجبور ہو جائے۔ اس شعر کو چھوڑ کر غزل کے باقی اشعار کو داغ کا تبرک سمجھ کر ہی گوارا کیا جا سکتا ہے۔ بیشتر اشعار ایسے ہیں جن میں کوئی نہ کوئی سقم نظر آرہا ہے مثلاً ؎

فسوں ہے یا دُعا ہے یہ معمّہ کھل نہیں سکتا
وہ کچھ پڑھتے ہوئے آگے مرے مدفن کے بیٹھے ہیں

غزل کا محبوب بڑا سنگدل اور بے نیاز ہوتا ہے۔ اس کی بے نیازی سے بعید ہے کہ وہ اپنے عاشق کی قبر پر بیٹھ کر اس کی ابدی نجات کے لئے دعا مانگے فسوں پھونکنا یعنی جادو پڑھنا بھی توہین حُسن ہے اور وقار محبوبی کے منافی۔ دوسرے مصرع میں "پڑھتے ہوئے بیٹھے ہیں" صحتِ زبان اور فصاحت کے نقطۂ نگاہ سے محلِ نظر ہے۔ اس قافیہ میں امیر مینائی کا یہ شعر ؎

ملا کر خاک میں بھی ہائے شرم اُن کی نہیں جاتی
نگہ نیچی کئے وہ سامنے مدفن کے بیٹھے ہیں

داغ کے شعر پر یقیناً فایق ہے۔ اگر لفظ نگاہ کو نثر کبھی صورت کے سوا حرف الف کی تخفیف کر کے نگہ باندھنا معیوب ہے تاہم داغ و امیر کے عہد میں جائز سمجھا جاتا تھا۔ اور عمومیت کے ساتھ باندھا جاتا تھا۔ داغ کے ایک اور ہم عصر جلال

لکھنوی کا شعر ؎

صبا کیا خاک اڑائیگی عدو کیا قہر ڈھائیں گے
وہ خود برباد کرنے کو مرے مدفن کے بیٹھے ہیں

تاثیر میں امیر مینائی کے شعر سے کمتر ہے مگر بے عیب ہے۔ اور داغ کے شعر سے برتر ہے۔

داغ کی اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

کسی کی شامت آئیگی کسی کی جان جائے گی
کسی کی تاک میں وہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھے ہیں

اس شعر کا دوسرا مصرع کسی وقارِ مجسّم محبوب کا تصور نہیں دلاتا بلکہ کسی حسن فروش شاہدِ بازاری کی شکل چشمِ تصور کے سامنے لے آتا ہے جو رنگین مزاج گاہکوں کی توجہ کھینچنے کے لئے آراستہ پیراستہ ہو کر بالاخانہ کے دریچہ سے زلف و رخسار کی جلوہ پاشی کرتا ہے ایسے عصمت باختہ کے ہاتھوں نہ تو کسی کی شامت آنے کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی کی جان جانے کا۔ پہلے مصرع کی روانی و شگفتگی لائقِ تحسین ہے۔ مگر دوسرے مصرع نے اس پر اوس ڈال دی ہے۔ اور اسے بے معنی بنا دیا ہے۔ پہلا مصرع پڑھنے سے خیال گزرتا ہے کہ کئی لوگوں کی شامت آئے گی اور کئی لوگ جان سے جاتے رہیں گے۔ لیکن دوسرا مصرع ظاہر کرتا ہے کہ بام پر بن ٹھن کے بیٹھنے والا صرف ایک مخصوص شکار کی تاک میں ہے۔ مندرجہ ذیل شعر ؎

یہ اٹھنا بیٹھنا محفل میں ان کا رنگ لائیگا
قیامت بن کے اٹھیں گے بھبوکا بنکے بیٹھے ہیں

کے دونوں مصرعے اپنی اپنی جگہ بڑے چست اور برجستہ ہیں لیکن آپس میں مضبوط

طور پر مربوط نہیں۔ سارے شعر میں ایسا کوئی نکتہ نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ محبوب بھبھوکا بن کے کیوں بیٹھا ہے اور قیامت بنکے کیوں اٹھیگا۔ محفل میں کسی ضرورت سے اٹھنا اور پھر بیٹھنا ایک عام معمول ہے۔ استاد بھبھوکا بنکے بیٹھنے اور قیامت بنکے اٹھنے کا نام دینا عجیب سی منطق ہے۔ اٹھنا بیٹھنا کا مطلب ہے ایک سے زیادہ بار اٹھنا اور ایک سے زیادہ بار بیٹھنا۔ مگر بھبھوکا بن کے بیٹھا ہوا شخص قیامت بن کے ایک بار ہی اٹھتا ہے۔ بار بار نہیں اٹھتا اور بیٹھتا۔ رنگ لانے کا مطلب ہے ناخوشگوار یا بھیانک صورت حال پیدا کرنا۔ لیکن اگر محبوب کے اٹھنے بیٹھنے سے شاعر کی مراد بھبھوکا بن کے بیٹھنا اور قیامت بن کے اٹھنا ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اٹھنا بیٹھنا اور کیا رنگ لائے گا۔ اسی غزل کا ایک اور شعر ہے

قسم دیکر انہی سے پوچھ لو تم رنگ ڈھنگ اُسکے
تمہاری بزم میں کچھ دوست بھی دشمن کے بیٹھے ہیں

زبان کی سلاست و پاکیزگی اور بیان کی سادگی و روانی کے اعتبار سے شعر بہت خوب ہے۔ دوسرے مصرع میں دشمن کی رعایت سے دوست یا دوست کی رعایت سے دشمن بڑے بے تکلف اور دلپذیر انداز میں منظوم ہوا ہے۔ قافیہ کے استعمال کی ندرت بھی قابل داد ہے۔ لیکن کیا دشمن خود بزم میں موجود نہیں اور اس نے اپنی نمائندگی کیلئے اپنے دوستوں کو بھیجدیا ہے؟

(۳۲)

مرزا شوق لکھنوی کی بلند پایہ مثنوی "زہر عشق" بدرجہ غایت درد انگیز اور رقت خیز ہے۔ اور زور بیان و تاثیر کلام کے لحاظ سے اپنا جواب نہیں رکھتی۔ اس کا ایک نہایت مشہور شعر ہے

مشورے ہو رہے ہیں آپس میں
بھیجتے ہیں مجھے بنارس میں

اس شعر میں محبوبہ اپنے عاشقِ صادق کو آگاہ کرتی ہے کہ میرے گھر والے مجھے تم سے دُور رکھنے کی تدبیر کر رہے ہیں۔ شعر بلا شبہ بڑا برجستہ ہے مگر اس کے دوسرے مصرع کے اخیر پر "لفظ" میں زائد ہے۔ بنارس میں رہنا یا بنارس میں پھرنا تو درست ہے لیکن بنارس میں بھیجنا محاورۂ زبان کے خلاف ہے۔

جناب سیماب اکبر آبادی بجا طور پر اپنے وقت کے باکمال اساتذہ اور ماہرینِ فن میں شمار ہوتے ہیں۔ اُن کا یہ شعر زبان زدِ خاص و عام ہے ؂

میری رُوداد رُودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اس شعر میں شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ جو شخص میری رُوداد سنتا ہے اُسے یہ اپنی داستان معلوم ہوتی ہے۔ یہ خامی شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "اُسے" نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ اس خامی کی وضاحت کے طور پر دوسرے مصرع میں تھوڑا سا تصرّف کر کے شعر یوں کہا جا سکتا ہے ؂

مری رُوداد رُودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے
کہ ہر سامع کو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

مرزا داغ کا شعر ہے ؂

یہ حُسن حُسن کے مرنا پڑا ہر کسی کو
نہیں مرتے دیکھا کسی پر کسی کو

شعر کے دونوں مصرع نہایت چست ہیں اور الفاظ کی برجستگی کے حامل ہیں

لیکن محاورہ کے نادرست استعمال کی وجہ سے اس میں توہینِ حُسن کا پہلو نمایاں ہو گیا ہے کسی پر مرتے کے معنی ہیں کسی پر عاشق ہونا۔ ان معنوں کی روشنی میں شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ محبوب اپنی کس مپرسی کا رونا رو رہا ہے اور دُہائی دے دے کر شکوہ کر رہا ہے کہ کوئی شخص مجھ پر عاشق نہیں ہوتا۔ ایک اور عجیب بات اس شعر میں یہ ہے کہ پہلے مصرع کا ٹکڑا "مر نا پڑا" جسمانی طور پر مرنے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ عشق کا جذبہ اختیاری نہیں اور کوئی شخص کسی کے کہنے سے اُس پر عاشق نہیں ہو سکتا۔ مجموعی طور پر شعر کا مضمون بہت مضحکہ خیز ہے۔ حسن و عشق کی دنیا میں کبھی اور کہیں بھی یہ نہیں ہوتا کہ محبوب عاشقوں کے قحط کا شاکی ہو۔ اور اس کی فریاد سن کر ساری دنیا میں اس پر عاشق ہونے کی لہر چل پڑے۔ حُسن ایک ایسی شمع ہے جس پر اہلِ دل خود بخود پروانہ وار گرتے ہیں۔

مرزا غالب کا یہ شعر تقریر و تحریر میں بڑی کثرت سے استعمال ہوتا ہے۔

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

یہ شعر توہینِ حُسن کا حامل ہے۔ ایسی لڑائی لڑنا محبوبوں کا کام نہیں۔ اور نہ اُن کی شان کے شایان ہے جس میں تلوار استعمال کرنے کی ضرورت ہو۔ غزلیہ شاعری میں قتلِ عشاق کے لئے محبوب کے شمشیر بکف ہونے کے مضامین کی کافی بہتات ہے۔ لیکن قتلِ عشاق کو لڑائی سے کوئی مناسبت نہیں۔ لڑائی لڑنے والے فریقین میں جانی دشمنی ہوتی ہے مگر عشاق محبوب سے پیار رکھتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھوں سے قتل ہونا انتہائی خوش قسمتی سمجھتے ہیں۔ اس بحث کی روشنی میں یہ شعر مہمل اور سراسر بے معنی ہے۔ اور

بازاری پن کا پہلو لئے ہوئے نظر آتا ہے۔ البتہ اکبر الہ آبادی نے اسے مزاح کا رنگ دے کر بامعنی بلکہ لافانی بنا دیا۔

پہلی عالمگیر جنگ میں جو اگست سنہ ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی اور نومبر ۱۹۱۸ء تک جاری رہی ہندوستان کی طرف سے بھی جرمنی کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا گیا۔ اُس وقت ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت تھی۔ اس لیے اس کا یہ اعلان ہندوستانیوں کے دلی جذبات کا مظہر نہیں تھا۔ بلکہ ان کے خلاف مرضی زبردستی ہندوستان کو جنگ کی آگ میں جھونک دینے کے مترادف تھا۔ قانونِ اسلحہ کی رُو سے کسی ہندوستانی کو لائسنس کے بغیر ہتھیار رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لحاظ سے ہندوستان عملی طور پر نہتوں کا ملک تھا۔

اکبر الہ آبادی نے اس حقیقت کے اظہار پر مشتمل ایک برجستہ اور برمحل نظم کہی۔ اور مرزا غالب کے اس شعر کو نظم کا آخری شعر بنا کر ہندوستان کی شرکت جنگ کا مذاق اُڑایا۔ اب یہ شعر پھر پڑھئے اور لڑنے والے کو محبوب کی بجائے ہندوستانی تصور کر کے اکبر کی مزاح طرازی سے لطف اندوز ہو جئے ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں!

(۴)

"جاں نثار" کے پچھلے شمارہ میں مرزا داغ کا شعرِ ذیل زیر تنقید آیا۔ ؎

بہت رویا ہوں جب سے میں نے یہ اک خواب دیکھا ہے
کہ آپ آنسو بہائے سامنے دشمن کے بیٹھے ہیں!

یہ شعر داغ کے چیدہ شاہکاروں اور اُردو شاعری کے بہترین گوہر پاروں میں جگہ پانے کے قابل ہے۔ عاشقِ صادق کے لئے اس سے زیادہ اذیت آفریں اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ محبوب رقیب کے سامنے بیٹھ کر زار زار روئے اور اُسے منانے کے لئے باچشمِ اشکبار التجائیں کرے۔

اس شعر میں خواب دیکھنا سپنا دیکھنا یعنی کسی منظر یا واقعہ سے دوچار ہونے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور اس کے صحیح معنی بھی یہی ہیں۔ مگر یہ بڑی حیرانی کی بات ہے کہ داغ کی ایک اور مشہور غزل کے ایک مطلع میں خواب دیکھنا نیند آنا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

نہ دل ہی ٹھہرا نہ آنکھ جھپکی نہ چین پایا نہ خواب دیکھا
خدا دکھائے نہ دشمنوں کو جو دوستی میں عذاب دیکھا

شعر کا دوسرا مصرع قابلِ داد زورِ کلام اور حُسنِ بیان کا حامل ہے۔ اس میں لفظ دوستی عاشقی کا ہم معنی ہے۔ اہلِ نظر جانتے ہیں کہ ذوقِ سلیم یہاں لفظ عاشقی کو گوارا نہیں کر سکتا۔ اس لفظ سے مصرع بہت بھدا ہو جاتا۔ لفظ دشمنوں کی رعایت سے بھی دوستی کا لفظ بڑا برمحل ہے۔

پہلے مصرع میں دل کے ٹھہرنے کو چین پانے سے تعبیر کرنا بہت موزوں ہے۔ اگرچہ نیند آنے کا پورا مفہوم آنکھ لگنا ہی سے ادا ہو سکتا ہے اور آنکھ جھپکنا ایک ایسا فعل ہے جو تھوڑے تھوڑے وقفہ سے غیر ارادی طور پر خود بخود ہوتا رہتا ہے۔ تاہم کھینچ تان کر اُسے بہت ہی تھوڑی دیر کی نیند سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن خواب دیکھنا کسی طرح بھی نیند آنے کے مترادف قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مرزا غالب کا شعر ہے ؎

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

پہلے مصرع میں لفظ "مگر" محلِ نظر ہے۔ عاشق کے جذبۂ دل سے محبوب کا متاثر ہونا اور بے قرار ہو کر عاشق سے ملاقات کے لئے آنا خارج از امکان نہیں۔ لیکن لفظ "مگر" نے مضمون کو الجھا دیا ہے۔ محبوب کو بلانا بھی توہینِ حسن کا مرتکب ہونا ہے۔ بلانے کے لفظ میں حکم کا مفہوم مضمر ہے۔ محبوب کو حکم دینے کی جسارت کون کر سکتا ہے اس سے تشریف لانے کی التجا ہی کی جا سکتی ہے۔

شیخ ابراہیم ذوق کا شعر ہے ؎

پشّے سے سیکھے شیوۂ مردانگی کوئی
گر قصدِ خوں کو آئے تو پہلے پکار دے

کسی پر بے خبری میں حملہ کرنا بلا شبہ بزدلی کی بات ہے۔ اور مردانگی اسی کا نام ہے کہ جس پر حملہ کرنا ہو اُسے خبردار کر دیا جائے۔ لیکن پشّہ (مچھر) کی مردانگی کون سی ضرب المثل ہے۔ وہ اگر گھُوں گھُوں کرتا پھرتا ہے تو وہ اپنے شکار کو چوکس کرنے کے لئے ایسا نہیں کرتا۔ یہ تو اس کا فطری فعل ہے۔

مرحوم جگر مراد آبادی بجا طور پر عہدِ رواں کے بہت ہی بلند پایہ اور مقبول ترین شعرا میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی قادر الکلامی، شکوہ بیانی اور پروازِ تخئیل مسلمہ ہے۔ اُردو کے خزانۂ شاعری کو رشکِ جواہر اشعار آبدار سے مالا مال کرنے میں ان کا حصہ بڑا قابلِ قدر ہے۔ ان کی مشہور غزل "نظر سے پہلے" "اثر سے پہلے" وغیرہ کا مطلع ہے ؎

یہ راز ہم پر ہوا نہ افشا کسی کا خاص اک نظر سے پہلے
ملی تھی ہماری ہی کم نگاہی ہمیں تھے کچھ بے خبر سے پہلے

تصوّف کا مضمون ہے اور بہت خوب ہے۔ لیکن پہلے مصرع میں لفظ ’خاص‘ اپنی جگہ پر نہیں۔ خاص اک نظر کی بجائے اک خاص نظر بندھ سکتا تو بہتر ہوتا۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے ؎

تجھے ہو سیرِ چمن مبارک مگر یہ رازِ چمن کبھی سُن لے
کلی کلی خون ہو چکی تھی شگفتِ گُل ہائے تر سے پہلے

اس شعر کا مفہوم وضاحت طلب ہے۔ شاعر جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ شعر کے الفاظ سے واضح نہیں ہوتا۔ تر و تازہ پھولوں کے کھلنے سے کلیوں کا خون ہو چکنا کون سی حقیقت یا کیفیت کا حامل ہے۔ شاعر نے اپنے مخاطب کو درسِ عبرت دینے اور سیرِ چمن سے باز رہنے پر آمادہ کرنے کے لئے جو دلیل پیش کی ہے وہ قطعاً غیر موثر ہے۔ جس طرح انسان بچپن کا زمانہ پورا ہو جانے پر لڑکپن میں اور لڑکپن کا زمانہ گزر جانے پر جوانی میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح کلیاں اپنا کلی پن ختم ہونے پر پھول بن جاتی ہیں۔ اس عمل کو کلیوں کا خون ہونے سے تعبیر کرنا ٹھیک نہیں۔

اسی غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

کہاں کہاں اُڑ کے پہنچے شعلے یہ ہوش کس کو یہ کون جانے
ہمیں بس اتنا ہے یاد اب تک لگی تھی آگ اپنے گھر سے پہلے

دوسرے مصرع میں لفظ ’اب تک‘ بے ضرورت ہے۔ اور ردیف بھی پورے طور پر چسپاں نظر نہیں آتی۔ بلکہ شعر میں ابہام پیدا کر رہی ہے ”لگی تھی“ کو شروع ہونے کے معنوں میں استعمال کرنا بھی صحیح نہیں۔

ایک اور شعر ہے ؎

قفس کی نازک سی تیلیوں کی بھی کچھ حقیقت ہے ہمصفیرو
مگر الجھنا پڑیگا شاید خود اپنے ہی بال و پر سے پہلے

اس شعر میں بھی دوسرے مصرع کا مفہوم غیر واضح ہے بہ ظاہر نہیں ہوتا کہ قفس کی تیلیوں کو توڑنے سے پہلے اپنے ہی بال وپر سے الجھنے کی ضرورت کیوں پیش آئے گی۔ ذیل کا شعر بھی جگرؔ جیسے بلند پایہ شاعر کی شان کے شایاں نہیں ؎

خوشا یہ بیماریٔ محبت نہ ہے یہ خودداری طبیعت
وہی ہیں مصروفِ دلنوازی وہی جو تھے بےخبر سے پہلے

پہلے مصرع کا ٹکڑا "خودداریٔ طبیعت" غیر فصیح ہے اور ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ بیماریٔ محبت عاشق کے حق میں بڑی نعمت ثابت ہوئی ہے۔ بیماری کے باوجود اس نے خودداری کا دامن نہیں چھوڑا اور برائے علاج ملتجی ہوکر محبوب کے در پر نہیں گیا۔ اس لئے خود محبوب کو اس کے پاس آنا اور اس کی دلنوازی کرنا پڑا۔ لیکن اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ محبوب پر محبت کا اثر ہو کے رہتا ہے تو اس کا کیا جواب ہے کہ محبت کا اثر اس وقت ہوتا ہے جب اس کی شدت مہلک اذیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ناقابل برداشت ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال کا اظہار محض بیماریِ محبت کے الفاظ سے نہیں ہو سکتا۔ جہاں تک خودداری کا سوال ہے عشق کی نسبت حسن کی اہلیت کہیں زیادہ ہے۔ حسن اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ دینے پر مائل ہو سکتا ہے تو صرف اسی صورت میں کہ عشق کی جان پر بن جائے۔ اس کے مقابلے میں عشق کی خودداری کا لبادہ اتار پھینکنے کے لئے حسن کا ایک مبہم سا اشارہ بھی کافی ہوتا ہے۔ شعر کے دوسرے مصرع میں لفظ "بےخبر" اپنے صحیح معنوں میں استعمال نہیں ہوا بلکہ محض برائے قافیہ لایا گیا ہے۔ شعر ذیل بھی حشو و زوائد سے بوجھل نظر آتا ہے ؎

زمانہ مانے نہ مانے لیکن ہمیں یہی ہے یقین کامل
جہاں اُٹھا کوئی تازہ فتنہ اُٹھا تیری رہگذر سے پہلے

زمانہ مانے نہ مانے، خلاف حقیقت اور شعر کا وزن پورا کرنے کے سوائے کوئی کام نہیں دے رہا۔ محبوب کی راہگزر سے فتنے اٹھنا ایسی بات نہیں جیسے زمانے سے منوانے کی ضرورت ہو۔ "ہمیں یہی ہے یقین کامل" کا ٹکڑا بھی بے ضرورت ہے اور محض شعر کا وزن پورا کرنے کے لئے نظم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ یقین کامل کسی ایسے واقعہ کے متعلق نہیں ہوتا جو ظہور پذیر ہو چکا ہو۔ بلکہ ایسے واقعہ کے متعلق ہوتا ہے جو ظہور پذیر ہونے والا ہو۔ الفاظ "ہمیں یہی ہے" استعمال تو کئے گئے ہیں یقین کامل کو زیادہ زور دار بنانے کے لئے۔ لیکن جس انداز سے استعمال کئے گئے ہیں اس سے اس میں کمزوری پیدا ہوگئی ہے اور مہمل پن آگیا ہے۔ کسی فتنہ کا پہلے پہل محبوب کی راہ گزر سے اُٹھنا بھی مہمل پن کا پہلو لئے ہوئے ہے کیا اس کے بعد وہی فتنہ کسی اور جگہ سے بھی اٹھتا ہے۔ دوسرے مصرع کا پہلا لفظ "جہاں" بالعموم ظرف مکاں کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ مگر یہاں ظرفِ مکاں کا کوئی محل نہیں۔ اگرچہ اسے ظرف زماں کے طور پر استعمال کرنا بھی غلط نہیں تاہم اس بارے میں کسی قسم کے شک و شبہ سے بچنے کے لئے مصرع کے پہلے میں یوں ترمیم ہو سکتی ہے ع

کہ جب اُٹھا کوئی تازہ فتنہ

(۵)

دورِ پنجم کے برگزیدہ اور صاحبِ طرز شاعر خواجہ حیدر علی آتش کے ممتاز شاگردوں میں نواب سید محمد خاں رند کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

اُن کا شعر ہے ؎

آ عندلیب مِل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

اُردو کے چیدہ اشعار میں شمار ہوتا ہے اُور تقریر و تحریر میں کثرت سے استعمال کیا جاتا ہے ۔ رِندؔ کی جس غزل کا یہ شعر ہے اس کا مطلع بھی ؎

پڑتی ہے آ کے جلن پر آخر بلائے دل
یارب کسی بشر کا کسی پر نہ آئے دل

خوب ہے ۔ مگر پہلے مصرع میں لفظ "آ کے" بے ضرورت ہے ۔ اور محض وزن پورا کرنے کے لئے ٹھونسا گیا ہے ۔ دوسرے مصرع میں بھی "کسی بشر" کی بجائے 'کسی' کافی تھا ۔ اور فصاحت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ یہاں لفظ 'بشر' استعمال نہ کیا جاتا اس لفظ سے مصرع کا وزن تو پورا ہو گیا لیکن 'کسی بشر کا' اور 'کسی پر' کے ٹکڑے باہم متوازن ہونے سے رہ گئے غزل کا حسن مطلع ہے ؎

غصہ ہے غم ہے خون جگر ہے برائے دِل
کھائے لمشوق جتنی کہ ہو اشتہائے دِل

غصہ کھانا اور غم کھانا تو محاورہ زبان ہے مگر خون جگر کھایا نہیں جاتا ۔ پیا جاتا ہے ۔ اور اس کے علاوہ غصہ کھانا بھی یہاں صحیح معنوں میں استعمال نہیں ہوا ۔ غصہ کھانا کے معنی ہیں اشتعال میں آ جانا ۔

تیسرا مطلع ہے ؎

یارب اسی طرح کوئی اس کا ستائے دل
ناحق عبث کسی کا جو کوئی دکھائے دل

مضمون پستی کی حد تک عامیانہ ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ "عبث"
زائد بھی ہے اور بے محل بھی۔

مطلع چہارم ؎

آ نے دے میری جان کسی پر جو آئے دِل
کچھ مشغلہ ضرور ہے آخر برائے دِل

کا مضمون بھی پست درجہ کی عامیانہ نوعیت کا ہے۔ اس میں بازاری پن
جھلکتا نظر آتا ہے۔ اور توہینِ عشق کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ پہلے مصرع میں
لفظ "میری جان" سے ظاہر ہے کہ کہنے والے کا مخاطب اس کا محبوب ہے
سوال پیدا ہوتا ہے کہ کون عاشق یہ گوارا کر سکتا ہے کہ اس کا محبوب کسی اور پر
فریفتہ ہو جائے۔ اپنے محبوب کو کسی دوسرے کی محبت میں مبتلا ہونے کی شہ
دینا بے غیرتی کی انتہا ہے اور عشق کی بدترین توہین۔ دوسرے مصرع میں لفظ
"آخر" محل نظر ہے۔ محبوب کو تو دنیا بھر کی راحتیں نصیب ہوتی ہیں اور
دلچسپی و لطف اندوزی کا ہر سامان اسے ذرا سے اشارے پر مہیا ہو سکتا ہے
دل کو مشغول رکھنے کے لئے وہ اس بات کا محتاج نہیں ہوتا کہ اس کا دل
کسی پر آ جائے۔ ایسا سمجھنا توہینِ حسن کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی غزل کا
شعر ہے ؎

تیرے بغیر کس کی تمنا کرے کوئی!
تو آرزوئے جان ہے تو مدعائے دل

دوسرے مصرع میں جان ترکیبی صورت کے باوجود بہ اعلان نون آیا ہے۔
شعرائے فارسی کے یہاں ترکیبی صورت میں نون کے اعلان کی مثال شاذ
و نادر ہی نظر آتی ہے۔ شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ بالکل ہی نظر نہیں

آتی۔ شعرائے اُردو بھی تراکیب کے استعمال میں بڑی پابندی کے ساتھ شعرائے فارسی کی تقلید کرتے ہیں۔ تاہم چونکہ غالب کے زمانہ تک اُردو کے تمام اساتذہ نے "ن" کا اعلان جائز رکھا۔ چنانچہ غالب ہی کا شعر ہے ؎

بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں
فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے

اور چونکہ رِند کا تعلق بھی دورِ غالب کے شعرا سے ہے اس لئے ان کی اس فروگذاشت کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ مگر شعر کے پہلے مصرع میں لفظ "سوا" کی بجائے "بغیر" کا استعمال فصیح نہیں بلکہ صحیح بھی نہیں۔ اس لفظ کے پیشِ نظر مصرع کے معنی یہ ہوں گے کہ اے محبوب! بستر تری موجودگی یا معیّت ہی میں کسی کی تمنا کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ مصرع کو یہ معنی پہنانے سے شعر مہمل ہو جائے گا۔ اگر لفظ بستر کی رعایت سے اس شعر کو تصوف کا رنگ دیا جائے تو بھی شعر مہمل ہی رہے گا۔ آخر تصوف کا بھی یہ کون سا مسئلہ ہے کہ کسی کی تمنا خدا کی موجودگی یا معیت ہی میں کی جاسکتی ہے

اس غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

آیا کسی طرح سے نہ فرقت میں جب قرار
لیٹا رہا میں ہاتھ کے نیچے دبائے دل

یہ شعر نہ ندرتِ خیال کا حامل ہے نہ جدّتِ بیان کا۔ اس میں محض قافیہ پیمائی کی گئی ہے۔ دل کو ہاتھ کے نیچے دبائے رکھنے سے دل کے جسمانی درد کا مٹ جانا یا کم ہو جانا تو ممکن ہے۔ مگر دردِ فرقت پر اس عمل کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ بیمارِ فرقت کے لئے چین سے لیٹے رہنا ناممکن ہوتا ہے اسے بار بار کروٹیں لینا اور پہلو بدلنا ہی پڑتا ہے۔

شعر ذیل سے

کرتے ہیں اشکِ آتشِ فرقت پہ کارِ نفت
ایسی لگی ہوئی کہو کیوں کر بجھائے دل

کے پہلے مصرع میں لفظ "نفت" بمعنی مٹی کا تیل بہت ثقیل ہے۔ غزل ایسے ثقیل لفظ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ کسی اور نامور شاعر نے شاید ہی اپنے غزلیہ کلام میں اس کا استعمال کیا ہو۔ دوسرا مصرع حشو و زوائد کا پلندہ ہے۔ الفاظ "ایسی لگی ہوئی" و "کہو" خصوصیت سے محلِ نظر ہیں۔ کسی پختہ گو اور خوش مشق کی زبان یا زبانِ قلم سے اتنا بے ڈھب اور سامعہ خراش مصرع نکالنا پڑے اچنبھے کی بات ہے۔ ذیل کا شعر بھی ایسے ہی اسقام اور بازاری پن کا حامل ہے سے

تو ایک بار ہنس کے گلے سے اگر لگائے
سینے میں خرمی سے نہ پھولا سمائے دل

محبوب اپنے عاشق کو گلے سے لگائے گا تو ہنسی خوشی ہی سے لگائے گا نہ کہ بہ جبر و کراہ یا رونی صورت بنا کر۔ دوسرے مصرع میں لفظ "خوشی" کی بجائے لفظ "خرمی" کا استعمال عجزِ طبع کی دلیل ہے سے

جو کچھ سلوک تو نے کئے اس غریب سے
کیوں بے وفا بتا تو یہی تھی جزائے دل

پہلے مصرع میں "اس غریب سے" کا ٹکڑا بڑا بر محل، فصیح و بلیغ اور تاثیر آفرین ہے۔ مگر دوسرے مصرع میں لفظ "جزا" بری طرح کھٹکتا ہے۔ جزا کسی کام یا خدمت کی ہوتی ہے۔ کام کرنے یا خدمت انجام دینے والے کی نہیں ہوتی اس مصرع میں "بتا" اور "تو" بھی وزن پورا کرنے کے لئے گھڑے گئے ہیں سے

تاب و توان و صبر و خرد کب کے چل دیئے
رکھتے ہیں کائنات میں ہم کیا سوائے دل

پہلے مصرع میں صبر و خرد کی بجائے صبر و سکون یا ہوش و خرد کا محل تھا مگر اس سقم کو کتابت کی غلطی گردان کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے مصرع میں لفظ "کائنات" "حرفِ جار" میں، کے ساتھ آنے سے کائنات کے معنی دنیا ہو گئے ہیں لیکن شعر کے مضمون کا تقاضا یہ تھا کہ اسے پونجی کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ۔

گاڑا فلک نے پھر کسی عاشق کو خاک میں
مرقد سے آرہی ہے صدا ہائے ہائے دل

پنجاب میں گاڑنا کے معنی عام طور پر نصب کرنا لئے جاتے ہیں۔ لیکن اُردو کے اہلِ زبان جیسا کہ غالب کے مشہور شعر ۔

وفاداری بشرطِ استواری اصلِ ایماں ہے
مرے بتخانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

سے ظاہر ہے کہ اسے بمعنی دفن کرنا بھی استعمال کرتے ہیں۔ لیکن گاڑنے والے کو فلک سے تعبیر کرنا بعید از حقیقت ہے مردے کی تدفین اس کے وارث اور احباب و اقارب کرتے ہیں۔ یا اگر لاش لاوارث ہو تو کوئی متعلقہ سرکاری یا نیم سرکاری یا سماجی ادارہ کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ خاک میں گاڑنا محاورہ کے منافی ہے صحیح اور فصیح زبان خاک میں گاڑنا نہیں۔ سپردِ خاک کرنا ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ "پھر" بے ضرورت ہے۔ اور وزن پورا کرنے کے سوا کوئی کام نہیں دے رہا ہے۔ دوسرا مصرع اگرچہ بجائے خود بے عیب ہے لیکن لفظ مرقد کی وجہ سے پہلے مصرع کے ساتھ بطریق احسن مربوط نہیں۔ پہلا

مصرع بے ہنگم ہونے کی وجہ سے سارا شعر بے ہنگم ہو گیا ہے۔

(۶)

پچھلے شمارہ میں رندؔ کی جس غزل کے اشعار پر تبصرہ کیا گیا تھا اس کا ایک اور شعر ہے ؎

سوراخ بھر گئے، کہ لہو ہو کے بہہ گیا
جو کچھ ہوا بچا تھا یہی تھی سزائے دل

اس شعر کے الفاظ مضمون سے ہم آہنگ نہیں۔ دل کا لہو ہو کے بہہ جانا تو جرمِ محبت کی سزا گردانا جا سکتا ہے، لیکن سوراخ بھر جانا چہ معنی دارد۔ پھر دل کو لہو ہو کے بہہ جانا کا مبتدا قرار دے لینا قواعد زبان کی رُو سے درست ہے۔ مگر یہ سمجھ میں آنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے کہ سوراخ بھر جانا کا مبتدا کیا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے مصرع میں لفظ "کہ" بطور حرفِ عطف بمعنی "یا" استعمال ہوا ہے اور مصرع کا مطلب یہ ہو گیا ہے کہ جرمِ محبت کی پاداش میں جو سزائیں ملتی ہیں ان میں سے دل کو یا تو یہ سزا ملی ہے کہ سوراخ بھر گئے یا یہ کہ دل لہو ہو کے بہہ گیا۔ دوسرے مصرع کا پہلا ٹکڑا "جو کچھ ہوا بچا تھا" برمحل بھی ہے اور برجستہ بھی۔ لیکن دوسرا ٹکڑا "یہی تھی سزائے دل" میں لفظ "یہی" محلِ نظر ہے جب یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ دل کو جو سزا ملی وہ سوراخ بھر جانا تھی یا لہو ہو کے بہہ جانا۔ تو یہی تھی سزائے دل کہنا صریحاً غلط ہے۔ اس غزل کے چند اور اشعار بھی ایسے ہیں جن کو بے عیب نہیں کہا جا سکتا۔ مثلاً ؎

ایسا کہاں انیس کہا ایسا غم گسار
بیگانہ سب سے ہے جو ہوا آشنائے دل

شعر کا مطلب ہے کہ جسے دل جیسے مونس و غم گسار کی آشنائی نصیب ہو جائے وہ کسی اور کی آشنائی کا محتاج نہیں رہتا۔ مگر عدم محتاجی کو بیگانگی سے تعبیر کرنا صحیح نہیں۔ جو شخص کسی اور کا محتاج نہ ہو وہ ضروری نہیں کہ ہر کسی سے بیگانگی کا سلوک کرے۔ بنیادی سقم اس شعر میں یہ ہے کہ "آشنائے دل ہوا" کے معنی واضح نہیں۔ دل تو انسان کے اپنے ہی جسم کا ایک حصّہ ہے۔ اس کا آشنا ہونا بے معنی سی بات ہے۔ البتہ اگر دل سے شاعر کی مراد دلِ محبوب ہو تو اس کی آشنائی نصیب ہو جانے پر انسان کا ذہن دو دنیا سے بیگانہ ہو جانا سمجھ میں آسکتا ہے۔ مگر شعر کے انداز و اسلوب میں ایسا کوئی پہلو نہیں نکلتا جس کی بنا پر دل سے مراد دلِ محبوب لی جاسکے ؎

اے نرگس تیری آنکھوں پہ عیاری ختم ہے
دونوں نے کیا کیا کہ ہزاروں اڑائے دل

دوسرے مصرع میں کناہت کی کچھ غلطی ہے جس کی وجہ سے مصرع مہمل معلوم ہوتا ہے۔ اس مصرع میں لفظ "دونوں" ذوقِ سلیم پر گراں گزرتا ہے۔ پہلے مصرع میں عیّاری کی "ی" بُری طرح دبی ہوئی ہے ؎

چندے یونہی جو مشقِ ریاضت یہی رہی
حیرت فزائے آئینہ ہو گی صفائے دل

شعر کا مفہوم تو بہت اچھوتا نہیں اور نہ کسی خصوصیت کا حامل ہے۔ تاہم دوسرے مصرع میں آئینہ کی رعایت سے لفظ حیرت جس خوبی سے استعمال کیا گیا ہے وہ بلا شبہ قابلِ داد ہے۔ حکیم مومن خاں مومن نے اپنی محبوبہ کی وفات پر جو زور دار اور پُر تاثیر مرثیہ کہا تھا اس کے ایک بند کا مطلع ہے
ویراں ہے خانۂ جلوۂ حیرت طراز کا   آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا

اس خوبی کی اور بھی زیادہ دلاویز مثال ہے۔ مگر رِندؔ کے شعر کا پہلا مصرع۔

چندے یونہی جو مشقِ ریاضت یہی رہی

سقیم ہے۔ اس میں یونہی کے معنی بھی وہی ہیں جو یہی کے ہیں۔ لطور وضاحت یہ سقم یوں دور ہو سکتا تھا۔ ع

چندے رہی جو مشق ریاضت اسی طرح

یا

جاری رہی جو مشقِ ریاضت اسی طرح

ذیل کے شعر کا پہلا ٹکڑا اہمال و ابہام کا پلندہ ہے اور دوسرے مصرع کے جواز سے عاری ہے

گستاخیاں ہیں بے ادبی کے کلام میں
کیوں کر کہوں زباں سے جو ہے مدعائے دل

انتیس ۲۹ شعروں کی اس غزل میں اور بھی کئی شعر بھرتی کے ہیں اور بے کیف و بے لطف قافیہ پیمائی کے سوا ان میں کچھ بھی نہیں۔ لیکن ے

اے عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو ہائے گل پکاریں چلاؤں ہائے دل!

اتنا پیارا شعر ہے کہ اسے ہر خوش ذوق بار بار چٹخارے لے لے کر پڑھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایسے اشعار حاصلِ غزل بلکہ حاصلِ زمین اور اپنے مصنف کی بلند مرتبگی کا منہ بولتا ثبوت ہوتے ہیں۔ اس پایہ کا ایک شعر بھی جس غزل میں ہو وہ بڑی کامیاب سمجھی جاتی ہے۔

رِندؔ کا یہ شعر بھی جو ایک غزل کا تیسرا مطلع ہے۔ ایسی ہی برجستگی

و شگفتگی کا حامل ہے اور پڑھتے یا سنتے ہی زبان پر چڑھ جاتا ہے ؎

کیا ملا عرضِ مدعا کر کے بات بھی کھوئی التجا کر کے

یہ غزل بھی کافی سے زیادہ طویل ہے اور ستائیس شعروں پر مشتمل ہے۔ مگر ایک آدھ مصرع چھوڑ کر اس کے بھی باقی اشعار بھرتی کے ہیں اور عام رواج کے مطابق محض قافیہ پیمائی کی قدرت کا مظاہرہ کرنے کے لئے کہے گئے ہیں مثلاً پہلا ہی مطلع ہے ؎

منہ نہ ڈھانکو عبث حیا کر کے نہ چھپو صورت آشنا کر کے

دونوں مصرعے مریل پن کی حد تک ڈھیلے ہیں۔ زبان بھی بہت بھدی ہے۔ پہلے مصرع میں لفظ "عبث" بے ضرورت ہے اور وزن پورا کرنے کے سوا کوئی کام نہیں دے رہا۔ اس لفظ کے صحیح استعمال کی مثال سرور جہان آبادی کا یہ شعر ہے ؎

میں انتظار میں شب بھر عبث رہا بیدار
حضور خواب میں آئیں گے یہ خیال نہ تھا

حیا کر کے منہ ڈھانکنا خلاف محاورہ ہے۔ صحیح زبان حیا سے منہ ڈھانکنا ہے۔ دوسرے مصرع میں "نہ چھپو" کا ٹکڑا محل نظر ہے۔ منہ ڈھانکنا کو چھپ جانے سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ چھپ جانا کے معنی ہیں نظر سے پورے طور پر اوجھل ہو جانا یہ معنی منہ ڈھانکنا پر اطلاق پذیر نہیں ہو سکتے ؎

حق اسیری کا تیری او صیاد جاؤں گا دام ادا کر کے

یہ شعر سر تا پا مہمل ہے۔ کسی کو اسیر یعنی قید کر کے رکھنا کون سی خدمت ہے جس کا حق ادا کرنا واجب ولازم ہے۔ اور مرغِ اسیر کے پاس کون سا خزانہ ہوتا ہے جسے حقِ خدمت کی مد میں پیسے پیسے کی ادائیگی کا کفیل سمجھا جا سکتا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے قفس کو ہوٹل اور صیاد کو ہوٹل کا مالک یا مینیجر تصور کر لیا ہے۔ اور مرغِ اسیر کو رہائشی گاہک طعام کے دام اور عرصۂ قیام کا کرایہ ادا کرنے والا مہمان جو اپنی مرضی سے آزادانہ اس ہوٹل میں آجا سکتا ہے ؂

پاسِ دیں کفر میں بھی تھا ملحوظ　　بُت کو پوجا خدا خدا کر کے

شاعر کہنا یہ چاہتا ہے کہ ہم نے کفر میں یعنی کافر ہو کر بھی دین کا پاس ترک نہ کیا اور بت کو خدا سمجھ کر یا قرار دے کر اس کی پرستش کی۔ لیکن جب اسی غزل کے شعر ؂

ہجر میں تھی کسے اُمیدِ سحر　　رات کاٹی خدا خدا کر کے

سے ظاہر ہوتا ہے کہ محاورہ زبان کے مطابق بت کو پوجا خدا خدا کر کے، کے معنی ہوں گے بُت کی پوجا بڑی مشکلوں سے اور بہت صعوبتیں اٹھا کر انجام دی۔ زیرِ تنقید شعر میں یہ محاورہ جیسا کہ زبان زدِ عوام مصرع "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے" سے ظاہر ہے اس مفہوم کا حامل بھی ہے کہ پوجا کی انجام دہی میں بڑا عرصہ لگ گیا۔ شاعر جو کچھ چاہتا ہے اُسے صحیح طور پر ادا کرنے کے لئے لفظ خدا کی تکرار سے احتراز کرنا۔ یعنی خدا خدا کی بجائے صرف خدا کر کے کہنا چاہیئے تھا تو یوں کہا جا سکتا تھا ؂

پاسِ دیں کفر میں بھی تھا ملحوظ
بُت کو پُوجا کئے خدا کر کے

یا

کفر میں پاسِ دیں رہے ملحوظ　　بُت کو بھی پوجئے خدا کر کے

(۷)

غالب نہ صرف اپنے دور کا عظیم ترین اردو شاعر تھا بلکہ بعد کے ادوار

پر بھی اس کی عظمت کی دوام مُہر ثبت ہے اور ابد تک ثبت رہے گی۔ مگر اُسے اپنی اُردو شاعری پر اتنا ناز نہیں تھا جتنا فارسی شاعری پر تھا۔ شعرائے ایران بھی فارسی شاعری میں ان کی عظمت کے قائل تھے اور اس کا لوہا مانتے تھے۔ اس میں اور ذوق میں ادبی چشمک اکثر ہوتی رہتی تھی۔ اس سلسلہ میں اس نے ذوق کو طنز و طعن کا نشانہ بنائے ہوئے ہدیں الفاظ اپنی فارسی شاعری پر ناز کا اظہار کیا تھا ؎

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ ۔۔۔ بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

راست می گویم بلے از راست سر نتواں کشید ۔۔۔ ہر چہ در گفتار فخر تست آن ننگِ من است

فارسی زبان و ادب پر اس کے ماہرانہ عبور کی جھلک اُس کے اردو کلام میں بھی جا بجا نظر آتی ہے۔

اور بدرجۂ غایت حسین و جمیل انداز میں نظر آتی ہے۔ اس نے فارسی تراکیب کا استعمال ایسی خوبی اور دلاویزی سے کیا ہے کہ پڑھنے اور سننے والے کے دل و دماغ پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مگر خال خال حالتوں میں حد سے زیادہ فارسیت ثقالت کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہے۔ مثلاً ؎

لبِ خشک در تشنگیِ مُردگان ۔۔۔ زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا

یہ بات کہ کسی شعر کے دونوں مصرعوں میں ردیف کے علاوہ ایک لفظ کے سوا سارے الفاظ فارسی کے ہوں گوارا کی جا سکتی ہے بشرطیکہ شعر کا مضمون جو بجائے خود بھی ناقابلِ داد ہو ان الفاظ کے بوجھ تلے نہایت بُری طرح نہ دب جائے اور پہیلی بن کر نہ رہ جائے۔ پہلے مصرعہ میں مُردہ کا صیغہ جمع مُردگان اور دوسرے میں دل آزردہ کا صیغہ جمع دل آزردگان اردو میں استعمال کرنا فصاحت

کے منافی ہے اور دیوانِ غالب میں بلکہ اس سے پہلے بھی متروک ہو چکا تھا۔ کم از کم معاصرین غالب کے کلام میں اس کی مثال ڈھونڈنا بڑا محال ہے۔ شعرِ غالب کے پہلے مصرع میں لفظ تشنگی سے پہلے حرف جار "در" تو نہایت ہی قبیح معلوم ہوتا ہے۔ اُردو کی سادہ نثر میں اس شعر کے معنی یہ ہیں کہ یہیں پیاس سے مرنے والوں کا سوکھا ہونٹ ہوں اور ستائے ہوئے دل والوں یعنی عاشقوں کی زیارت گاہ۔ کوئی بتائے کہ پیاس سے مرنیوالے سوکھے ہونٹ کو زیارت گاہِ عشاق سے تعبیر کرنا کس منطق کی رُو سے جائز ہے۔ پھر پیاس سے مرنے والے تو کئی ہیں اور سوکھا ہونٹ صرف ایک ہی ہے۔ ایسے ہی انتقاد کے پیش نظر آزردہ نے ایک محفلِ سخن میں غالب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پھبتی کسنے کے طور پر کہا تھا ؎

کلامِ میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

سطورِ ماقبل میں غالب کا جو شعر زیرِ تنقید آیا ہے اس زمین میں ایک اور شعر بھی اس نے کہا ہے ؎

ہمہ نا اُمیدی ہمہ بدگمانی میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

یہ شعر پہلے شعر کے مقابلے میں بڑا پر معنیٰ ہے۔ اس کا پہلا مصرع تمام و کمال فارسیت کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہونے کے باوجود زبان کی فصاحت اور بیان کی بلاغت کا بڑا دلنواز اور رُوح پرور نمونہ ہے۔ فریبِ وفا کھانے والوں کا دل بلاشبہ ناامیدی اور بدگمانی کا جگر خراش مجسمہ ہوتا ہے مضمون کے لحاظ سے بھی شعریت بلیغ اور ندرتِ تخئیل اور رفعتِ پرواز کا حامل ہے۔ اور سوز و گداز اور درد و اثر کی شدت نے اسے نشتر بنا دیا ہے۔ لیکن اس کے

دوسرے مصرع میں فریبِ وفا خوردگان کی ترکیب محلِ نظر ہے۔ سیاق اردو کے مطابق فریب خوردگانِ وفا ہونی چاہیئے۔ پہلے شعر کے لبِ خشک کی طرح اس شعر میں بھی لفظ دل صیغۂ واحد میں بندھا ہے۔ حالانکہ فریب وفا خوردگان ایک سے زیادہ ہیں۔

۵

شب کو وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا
رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا

شعر کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ نہ مضمون الفاظ پر بھاری ہو اور نہ الفاظ مضمون پر بھاری ہوں۔ مگر یہ شعر اس خوبی سے معرّا ہے۔ اس میں مضمون پر الفاظ کا بوجھ اتنا زیادہ ہے کہ نزاکت مضمون یکسر زائل ہوگئی ہے۔ مضمون صرف یہ ہے کہ محبوب کے حسن کی تابانی پر شمع فروزاں کو بھی رشک آتا ہے۔

اتنے سے مضمون کو ادا کرنے کے لیے خلوتِ ناموس کی محلس سجائی اور رخسارِ محبوب کی درافشانی سے سجائی گئی۔ ساتھ ہی بہت سی شمعیں (موم بتیاں) روشن کردی گئیں اور ان کے فانوس پر باریک کپڑے کا پردہ ڈال دیا گیا۔ موم کے پگھل جانے سے بتیوں کے دھاگے ننگے ہو گئے اور کانٹوں کی شکل اختیار کر گئے۔ اس صورت حال کو شمعوں کے خار دار پیرہن یعنی خلشِ رشک میں مبتلا ہونے سے تعبیر کر لیا گیا۔ ماننا پڑے گا کہ یہ لمبا چوڑا عمل فارسی کی ضرب المثل کوہ کندن و کاہ برآمدن یا اردو کی ضرب المثل کھودا پہاڑ نکلا چوہا کی جامع تفسیر ہے۔ اور محض فارسی کی مہارت تام کے زور سے شعر کے خد و خال کو معرض تشکیل میں لایا گیا ہے ؎

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس ہے

اس شعر میں نمایاں ترین خامی یہ ہے کہ اس کا انداز غالب کے انداز سخن سے بہت مختلف بلکہ اس کے بالکل الٹ ہے۔ غالب نے ایسے عامیانہ انداز میں شعر کہنا اپنی توہین سمجھ کر اسے پرانی ڈگر پر چلنے والے ذوق و ناسخ جیسے معاصرین کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اس سے بھی بڑا نقص اس شعر میں یہ ہے کہ اس کا مضمون خلاف حقیقت اور تاثیر سے خالی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ محبوب کی پابوسی کے آرزومند جہاں کہیں شہید ہوں وہاں حنا ہی اُگے گی۔ ذوق کا شعر ہے ؎

بجھنے کی دل کی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میری چنار کا

بھی اسی اعتراض کی زد میں آتا ہے۔ لیکن شعر ذوق کے دوسرے مصرع میں لفظ "ہوگا" سے اس اعتراض کی شدت کم ہو جاتی ہے، کیونکہ اس لفظ کی بدولت ذوق کا شعر ایک پیش گوئی کا حامل بن گیا ہے۔ اور پیش گوئی اگر غلط بھی نکلے تو اسے آئی گئی بات کہا جاسکتا ہے۔ مگر غالب کا شعر جس حقیقت کا حامل ہے وہ بنائی ہوئی بات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ غالب کی عظمت اس قسم کے شعروں پر مبنی نہیں بلکہ ایسے شعروں پر ہے ؎

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غم گسار ہوتا

اور ایسے اشعار کلام غالب میں کثرت سے ملتے ہیں۔

مرزا غالب کی غزل جس کی ردیف ہے "اچھا ہے" اور جس کے قوافی کمال حال۔ مال۔ جال وغیرہ ہیں مقبول خاص و عام ہے۔ اس کا شعر بلاشبہ حاصل زمین ہے ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے رونق منہ پر
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

اس زمین میں کئی اور اساتذہ سخن نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اور جدت وندرت کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن اس پایہ کا شعر خصوصاً اس قافیہ میں کسی سے نہیں ہوسکا۔ غالباً کسی مشاعرہ کے لیے کبھی اسی قافیہ میں یہ مصرع طرح دیا گیا تھا ع

'ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے'

اس مصرع پر مرزا داغ نے گرہ لگا کر مطلع بنا دیا تھا جو یہ ہے ؎

یہ تری چشم فسوں گر میں کمال اچھا ہے
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

یہ مطلع اپنی جگہ پر مطلع انوار ہے۔ مگر داغ کے مشہور ہم عصر جلال لکھنوی جو داغ کی ہم پائیگی کے دعویدار تو نہیں تھے جو گرہ لگائی اس نے کچھ اور ہی لطف پیدا کر دیا۔ ملاحظہ فرمائیے ؎

دل مرا آنکھ تری دونوں ہیں بیمار مگر
ایک کا حال بُرا ایک کا حال اچھا ہے

داغ کی غزل کا مقطع بھی اسی قافیہ میں ہے اور بہت خوب ہے ؎

آپ پچھتائیں نہیں جور سے توبہ نہ کریں
آپ گھبرائیں نہیں داغ کا حال اچھا ہے

غزل کے ایک اور شعر میں بھی داغ نے یہ قافیہ باندھا اور بڑی خوبی سے باندھا ہے۔ دیکھیے ؎

فرقتِ یار میں جینے کے اٹھائے الزام
ہم مرے جاتے ہیں جس روز سے حال اچھا ہے

داغ کی غزل کا یہ شعر بھی حسن کلام کا دلاویز نمونہ ہے ؎

جب شب ہجر دعا وصل کی مانگی میں نے
ہنس کے تقدیر پکاری کہ خیال اچھا ہے

لیکن سب اشعار کی موجودگی میں بھی یہ حقیقت بدستور قائم ہے کہ غالب کا شعر اپنی مثال آپ ہی ہے۔ خود غالب کی غزل کا بھی کوئی شعر اس شعر کا لگا نہیں کھا سکتا۔ اسی غزل کا مطلع ہے ؎

حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگام کمال اچھا ہے
اس سے میرا مہ خورشید جمال اچھا ہے

اس مطلع کے پہلے مصرعہ میں قافیہ کمال اور دوسرے میں قافیہ جمال اس لحاظ سے محل نظر ہے کہ غزل کے باقی شعروں میں جو الفاظ قافیہ آئے ہیں وہ کمال اور جمال کے ہم قافیہ نہیں۔ اصول فن کی پوری پوری پابندی کا تقاضا یہ ہے کہ اگر مطلع کے پہلے مصرعہ میں قافیہ کمال رکھا گیا ہے اور دوسرے مصرع میں جمال تو غزل کے باقی اشعار کے دوسرے مصرعوں میں شمال وغیرہ قافیے لائے جائیں نہ کہ خیال۔ سفال اور سوال وغیرہ۔ میرا اپنا یہ شعر بھی اسی نادرست کا حامل ہے ؎

چلی خزاں کی ایسی ہوا رنگِ چمن بگڑا
فضائے سبزہ بگڑی منظر سرو سمن بگڑا

چمن اور سمن کے ہم قافیہ الفاظ دمن۔ یمن۔ جمن وغیرہ ہیں۔ لیکن میری غزل کے دوسرے اشعار وطن۔ چلن۔ دہن وغیرہ قافیوں میں ہیں۔

اگرچہ اساتذۂ فن نے اس عیب کو عیب قرار نہیں دیا اور قریب قریب ہر استاد کے کلام میں ایسے مطلعے موجود ہیں جن میں یہ عیب پایا جاتا ہے چنانچہ داغ کی ایک غزل کا مطلع ہے ؎

خاطر سے یا لحاظ سے وہ مان تو گیا
جھوٹی قسم سے آپ کا ایمان تو گیا

مگر ذوقِ سلیم کی کامل تسکین کے نقطۂ نگاہ سے بہتر یہی ہے کہ اس عیب سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

غالب کا یہ مطلع مضمون اور اندازِ بیان کے اعتبار سے بہت بلند نہیں۔ اس کا مضمون بالکل سامنے کا ہے اور غالب کے اندازِ بیان کی امتیازی خصوصیت سے بھی عاری ہے۔

اس کے علاوہ حسن مہ اور مہ خورشید جمال کا مقابلہ بھی کچھ موزوں معلوم نہیں ہوتا۔ حسنِ مہ کے معنی ہیں چاند کا حسن اور مہ خورشید جمال کے معنی سے مراد محبوب جو سورج ایسا جمال رکھتا ہے۔ مرزا غالب کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میرا محبوب سورج ایسا جمال رکھنے کے باعث چاند سے اچھا ہے۔ مگر یہ کہہ گئے ہیں کہ میرا محبوب چاند کے حُسن سے اچھا ہے بالفاظ سادہ اس شعر میں نقص یہ ہے کہ ایک صاحب حُسن کا مقابلہ دوسرے صاحبِ حُسن سے کرنے کی بجائے دوسرے صاحب حسن کے حُسن سے کیا گیا ہے۔ غالب کی اس غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

یہ شعر بھی عامیانہ ہے اور غالب کے اندازِ بیان کی ندرت بھی اس میں نظر نہیں آتی۔ ساغرِ جم کو جامِ جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ روایت کے مطابق یہ جامِ ندیں ایران کے بادشاہ جمشید نے منوایا تھا اور اس میں

ایک نقشہ منقش تھا جس سے دنیا بھر کا حال معلوم ہو جاتا تھا۔ اس جام پر سفال یعنی مٹی کے پیالے کو ترجیح دینے کی یہ وجہ چنداں وزن دار نہیں کہ مٹی کا پیالہ ٹوٹ جائے تو بازار سے اس کی جگہ اور پیالہ لایا جا سکتا ہے۔ الفاظ مرا جام سفال کا مفہوم یہ ہے کہ غالب کا یہ جام سفال ہی جام جم سے اچھا ہے ہر جام سفال نہیں ہوگا تو مصرع کا مفہوم بھی بڑی حد تک واضح ہو جاتا ہے اور غالب کی سادگی پسندی و قناعت کشی پر دلالت کرتا ہے۔

لیکن اگر شعر کے پہلے مصرع 'اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا' کی روشنی میں غور کیا جائے تیرا جام سفال اچھا ہے کا مفہوم یہ ہوگا کہ ساغر جم سے جام سفال کا بہتر ہونا ایسی حقیقت نہیں جو اس جام سفال کا بہتر ہونا ایسی حقیقت نہیں جو اس جام سفال سے مخصوص ہو جو غالب کے پاس ہے بلکہ جو بھی جام سفال غالب خرید لائے وہ ساغر جم سے بہتر ہو جاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اس مصرع کو غالب کی سادگی پسندی و قناعت کشی کا نمایاں ثبوت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ اس ثبوت میں کمی کا موجب بن جاتا ہے۔

غزل میں بوس و کنار کا مضمون باندھتے ہوئے بازاری پن سے بچنا بہت مشکل ہے۔ مرزا غالب بھی نہیں بچ سکے زیر تنقید غزل میں ان کا یہ شعر عریاں قسم کے بازاری پن کا نمونہ ہے ؎

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

بازاری پن کا حامل ہونے کے علاوہ یہ شعر خلاف حقیقت بھی ہے۔

محبوب کو یہ ضرورت نہیں ہوتی کہ عاشق کے دل کو للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھے۔ وہ تو خود بخود اس کی طرف کھچا چلا آتا ہے اور اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جاتا ہے یا شمعِ رخسار کا پروانہ بن جاتا ہے۔ پھر ایسے مال کی طرف للچائی ہوئی نگاہوں سے دیکھنا تو قطعاً غیر قدرتی ہے جس کا اچھا ہونا اس بات سے مشروط ہو کہ مفت ہاتھ آجائے۔ غالبؔ کا یہ شعر بھی بازاری پن کا عریاں نمونہ ہے ؎

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خُو
دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کئے

سیاقِ تغزل کی رُو سے رقیب کے ساتھ بے تکلفانہ بوسہ بازی کی حد تک محبوب کے اختلاط کا مقصد عاشقِ صادق کو رشک و حسد کی آگ میں جلانا ہوتا ہے۔ غیر کے ساتھ اس قدر اختلاط کے باوجود وہ عاشقِ صادق کے ساتھ ہمیشہ کبر و نخوار بے رخی ہی سے پیش آتا ہے اور اسے اپنے نزدیک آنے کی جرأت نہیں ہونے دیتا۔ بے مانگے بوسے دینا تو بہت دُور کی بات ہے۔ بوس و کنار کے مضامین میں مرزا داغؔ نے بھی بازاری پن کا مظاہرہ کیا ہے۔ چنانچہ اُن کا شعر ہے ؎

ہم بوسہ لے کے اُن سے عجب چال کر گئے
یوں بخشوا لیا کہ یہ پہلا قصور تھا

کسی سے چال کرنے کے معنی ہیں اُسے بے وقوف بنانا یا دھوکا دینا یہ بات سراسر فطرتِ عشق کے منافی ہے۔ شعر کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عاشق عشقِ صادق کا پیکر نہیں بلکہ گھٹیا قسم کے اوباش دل پھینک ہیں۔

(۹)

اُردو کے شہرۂ آفاق اور بلند پایہ فصیح البیان مرثیہ نگار میر ببر علی انیسؔ کی ایک غزل کا شعر ہے ؎

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

پنجابی سیاق کے مطابق دوسرے مصرع میں کلمۂ ربط 'ہے' کی بجائے 'ہیں' ہونا چاہیئے۔ "ہے" صرف اس صورت میں جائز ہو سکتا ہے شجر سایہ دار کی تعداد معین ہو یعنی مخصوص طور پر بیان کی گئی ہو۔ ہزاروں کا مطلب پانچ ہزار بھی ہو سکتا ہے۔ چھ ہزار بھی۔ آٹھ ہزار بھی۔ دس ہزار بھی علیٰ ہذا القیاس۔ بیس۔ پچیس۔ تیس۔ چالیس پچاس ساٹھ اور ستر ہزار بھی۔ پنجابی میں یوں کہنا خلافِ محاورہ ہے کہ فلاں شخص کے پاس ہزاروں مرغی ہے اور امرتسر سے جالندھر تک کی سڑک پر ہزاروں درخت ہے۔ صحیح یوں کہنا ہوگا کہ فلاں شخص کے پاس دو ہزار یا چار ہزار یا سات ہزار (جیسی بھی صورت ہو) مرغی ہے اور امرتسر سے جالندھر کی سڑک پر آٹھ ہزار یا چھ ہزار یا چھ سو درخت ہے۔ اگر تعداد ایک ہزار یا ایک لاکھ ہو تو لفظ "ایک" حذف بھی کیا جا سکتا ہے۔ تعداد کو مخصوص کرنے کے علاوہ یہ بھی ملحوظ رکھنا ہوتا ہے کہ مخصوص شدہ تعداد ایک سو سے کم نہ ہو۔ اس لحاظ سے یوں کہنا غلط ہے کہ فلاں شخص کے پاس بیس یا چونتیس یا چھیالیس اور علیٰ ہذا القیاس جیسی کہ صورت ہو چھپن۔ ساٹھ یا ارسٹھ یا پچانوے مرغی ہے۔

سطورِ بالا میں لفظ تعداد استعمال کیا گیا ہے کیونکہ دس ہزار مرغی ہے کی بجائے دس ہزار مرغیاں ہیں کہنا بھی صحیح ہے۔ مطلب یہ کہ

"ہے" کا استعمال صرف جائز ہی ہے ضروری نہیں۔

پنجاب والے اردو زبان کے استعمال میں بڑی سختی کے ساتھ اہلِ زبان کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسے فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ شعرِ انیس کے ضمن میں اوپر جو بحث کی گئی ہے اس کی روشنی میں کیا یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ اُردو کے اہلِ زبان بھی جہاں مناسب اور ضروری ہو پنجابی سیاق کے اپنانے کے سوال پر غور کریں گے۔

اس سلسلہ میں تقسیم وطن سے پہلے کی ایک بات یاد گئی۔ میں اپنے شفیق دوست بلیغ الملک شمس العلما علاّمہ تاجور نجیب آبادی سے گلہ کر رہا تھا کہ آپ وعدہ کرنے کے باوجود ...... کل شام کو میرے مکان پر نہ آئے۔ اس گلہ سرائی کے دوران میری زبان سے آپ کا بہت انتظار کیا' کی بجائے آپ کو بہت اُڈیکا نکل گیا۔ حسنِ اتفاق سے اس وقت اُردو کے مشہور اور فاضل محقق مرحوم علاّمہ برج موہن دتاتریہ کیفی بھی وہاں موجود تھے۔ وہ لفظ 'اُڈیکا' پر اظہار تعجب کرتے ہوئے بولے۔ یہ تو پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ آپ نے اُردو میں بات کرتے ہوئے یہ کیسے استعمال کر دیا۔ میں نے بحث برائے بحث کے انداز میں استفسار کیا کہ اُڈیکنا کا متبادل لفظ اُردو میں کیا ہے۔ انہوں نے فرمایا انتظار کرنا' میں نے کہا کہ یہ لفظ تو دو الفاظ کا مرکب ہے اور ان دو الفاظ میں بھی انتظار عربی زبان کا ہے۔ کوئی مفرد لفظ بتائیے میرا یہ اعتراض انہوں نے تسلیم کر لیا کہ واقعی اُردو میں اُڈیکنا کا مفرد متبادل کوئی نہیں۔

میں نے کہا کہ اگر آپ قائل ہو گئے ہیں تو اسے اُردو لفظ کے طور پر اپنا لیجئے۔ تحقیقِ زبان کے میدان میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اس

لئے آپ اسے اپنانے کے مجاز ہیں - آخر فارسی - عربی - ترکی - انگریزی اور فرانسیسی زبانوں کے بہت سے الفاظ اردو میں شامل کرہی لئے گئے ہیں اور بے تکلفی سے استعمال کئے جارہے ہیں -

میر انیسؔ کا زیر بحث شعر بلاشبہ دھوم دھامی ہے - لیکن اس کے دوسرے مصرع سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسافر نوازی مسافر کو محض سایہ مہیا کرتے تک ہی محدود ہوتی ہے - مسافر کو بھوک پیاس بھی تو لگتی ہے پہلے مصرع میں سفر ہے شرط کا ٹکڑا ضرورت سے زیادہ زورِ بیان کا حامل ہے -

کسی مشہور شاعر کا شعر ہے ؎

دریا ہیں آب دشت میں ریگ رواں رہے
عالم روا روی کا رہا ہم جہاں رہے

بھی ایسا ہی دھوم دھامی شعر ہے - اور بہت خوب ہے - البتہ یہ واضح نہیں کہ عالمِ رواروی کا تعلق متکلم سے ہے یا اس سے مراد عام ماحول ہے -

شمس العلما مولانا حالی مرحوم کا یہ شعر بھی دھوم دھامی اشعار میں شمار ہونے کے قابل ہے ؎

یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

- بعض اصحاب سے اس شعر کے پہلے مصرع میں محمل کی بجائے منزل بھی سنا ہے لیکن یہ صحیح نہیں - "جا لیا" میں یہ مفہوم مضمر ہے کہ جس ہستی کو جا لیا گیا ہے وہ جا لینے والے سے بہت آگے جارہی تھی یا بہت دیر پہلے روانہ ہو چکی تھی - منزل تو غیر متحرک ہوتی ہے - اور اپنی جگہ نہیں بدلتی - مگر یہاں لفظ "محمل" بھی محل نظر ہے کیونکہ محمل سے مراد محملِ لیلیٰ اور محملِ لیلیٰ سے

مراد محبوب کی سواری ہے۔ اور محبوب کے متلاشی ایک دوسرے کے رقیب اور جانی دشمن ہوتے ہیں۔ وہ محبوب کی تلاش کے مقصد سے اپنے آپ کو کارواں کی شکل میں منظم نہیں کرتے۔

لسان العصر علامہ اکبر الہ آبادی کی دیکھا دیکھی ڈاکٹر اقبال نے بھی مزاح نگاری کے میدان میں بھی دادِ کمال دینے کی کوشش کی لیکن اس میں انہیں کامیابی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ علامہ اکبر مغربی تہذیب اور مغربی تہذیب کے دلدادہ ہم وطنوں کو نشانہ تضحیک بناتے تھے اور بات بات میں ظرافت کا رنگ بھر دیتے تھے۔ ڈاکٹر اقبال کی مزاحیہ شاعری میں یہ بات نظر نہیں آتی۔ علامہ اکبر کی طرح انھوں نے بھی مغربی تہذیب پر چوٹیں کیں مگر اس ضمن میں وہ اہلِ مغرب کو جلی کٹی سنانے تک ہی محدود رہ گئے۔ اس سے آگے نہ جا سکے ان کی غزل کا ایسا ہی ایک شعر ہے ؎

دیارِ مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

یہ شعر رنگ ظرافت سے تو عاری ہے ہی شگفتگیِ بیان کا بھی حامل نہیں۔ اس میں زور ہے نہ وہ اثر ہے جو کلام اقبال کی نمایاں خصوصیت سمجھا جاتا ہے، اربوں کھربوں میل سے بھی بے اندازہ زیادہ لمبی چوڑی کائنات کو جس میں ہماری یعنی کرۂ ارض کی حیثیت اتنی بھی نہیں جتنی سمندر میں ایک قطرے کی ہوتی ہے۔ بستی سے تعبیر کرنا عجزِ طبع کی دلیل ہے۔ بستی کا مفہوم تو گنتی کے گھروں پر مشتمل ایک چھوٹی سی آبادی ہوتا ہے۔ بستی اور دکان کا تقابل بھی بڑا عجیب اور مضحکہ خیز ہے۔ سونا کھرا ہے یا کھوٹا اس کی پرکھ بستی کے گلی کوچوں میں نہیں ہوتی۔ دکان ہی پر ہوتی ہے اور نہ بھی ہر دکان پر نہیں بلکہ صراف کی کسی دکان پر۔

اس غزل کا ایک اور شعر ہے ؎

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

یہ شعر بھی اہلِ مغرب کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے۔ مہابھارت کی تباہ کن جنگ کا واقعہ اس روایت کی تصدیق کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ جب سائنس ترقی کی انتہا پر پہنچ جاتی ہے تو سائنس دانوں کو بھی اپنے ساتھ لے مرتی ہے۔ اس شعر کی بنیاد اسی روایت پر ہے۔ لیکن شاخِ نازک پر بنے ہوئے آشیانہ کی ناپائداری ایسی صورتِ حال کی موزوں مثال اور صحیح آئینہ دار نہیں جیسی مہابھارت کی جنگ کے بعد پیدا ہوگئی تھی۔

نواں باب

سنگِ میل کے بعد کا کلام

ممکن نہیں ایسا راز رہے رازِ محبت
اب ضبطِ محبت بھی ہے غمّازِ محبت

اُس شوخ کو بھی آگئے اندازِ محبت
اعجازِ محبت ہے یہ اعجازِ محبت

اعجاز در اعجاز ہے اعجازِ محبت
بے بال و پری پر بھی ہے پروازِ محبت

کیا پوچھتے ہو رفعتِ پروازِ محبت
تا اَوجِ ثریا ہے تگ و تازِ محبت

مقصودِ تگ و تازِ محبت ہی تگ و تاز
منزل نہیں مقصودِ تگ و تازِ محبت

با یورشِ آلام و بہ ناسازیِ ایام
آئینۂ ایام ہے آغازِ محبت

آغازِ محبت کی کہانی ہے بس اتنی
آنکھیں لڑیں اور ہو گیا آغازِ محبت

آبستا ہے دل میں کوئی نادیدہ پری رُو
ہو جاتا ہے یوں بھی کبھی آغازِ محبت

نادان نہ بن عہدہ برآ ہو نہ سکے گا
اُس نازِ مجسّم سے ترا نازِ محبت

بقیۂ یک قافیہ

برسوں سے ہوں زمزمہ پردازِ محبت
آئی نہ جواباً کبھی آوازِ محبت

اِک دردِ محبت ہے مری ہر رگ و پے میں
ہر سانس ہے میرا اب اِک آوازِ محبت

ہر چند کہ ہر بزم میں ٹھکرائی گئی ہے
آوازِ محبت ہے پھر آوازِ محبت

معمور ہیں آوازِ محبت سے فضائیں
مستور ہے گو صاحبِ آوازِ محبت

دن رات کبھی درد بھرے دل کی لگن میں — آوارۂ آفاق ہے آوازِ محبت
آجائے ذرا سینۂ آفاق میں گرمی — ہو جائے ذرا شعلہ زن آوازِ محبت
یہ دور ہے دورِ ہوس اس دور میں اے دل — سنتا نہیں دل سے کوئی آوازِ محبت
جس شخص کے سینے میں ہے دل کی جگہ پتھر — سمجھے گا وہ کیا معنیٔ آوازِ محبت

اس دورِ تگ و دو میں وفا کون سنے گا
کتنی ہی دلاویز ہو آوازِ محبت

ڈھل جاتی ہے نغموں میں خود آوازِ محبت — مضراب کا محتاج نہیں سازِ محبت
ہوتے ہیں سرافراز سخن سازِ محبت — دھتکار دیئے جاتے ہیں جانبازِ محبت
پوری نہ ہوئے لائق اعزازِ محبت — خاکی ہی کو تفویض ہوا رازِ محبت
دم بازیوں پہ آگئے دمسازِ محبت — اب کون کسی کو کرے ہمرازِ محبت
یہ حسن و محبت کا ہے دلچسپ تصادم — تو حسن پہ نازاں ہے مجھے نازِ محبت
ہر دور میں ہوتی تھی عداوت علی الاعلان — اس دور میں ہوتی ہے باندازِ محبت
تکنے لگے اہلِ ہوس اک دوسرے کا منہ — جب کود گیا آگ میں جانبازِ محبت
رم کرتے ہیں وہ مجھ سے تو مجھ کو ہو گلہ کیوں — رم بھی تو ہے اک صورتِ اندازِ محبت

بے معنی و بیہودہ و باطل ہے سراسر
مجبورِ محبت کا وفا نازِ محبت

ہوتا ہے دلِ سوز بجاں سازِ محبت — اٹھتی ہے اسی ساز سے آوازِ محبت
میں رات کے سناٹے میں سنتا ہوں لگاتار — تاثیر میں ڈوبی ہوئی آوازِ محبت
بجتے ہیں مرے کان کہ آتی ہے کہیں سے — آوازِ محبت بس آوازِ محبت
کرتا ہوں میں آوازِ محبت کا تعاقب — اور میرے تعاقب میں ہے آوازِ محبت
کھیتوں میں چراگاہوں میں ہوں میں پھراتی — لے جائے کہاں دیکھئے آوازِ محبت

کچھ ہے کبھی اس آواز کے پردے میں کہ باز — آواز ہی آواز ہے آوازِ محبت
آوازِ محبت تو ہے دُنیا سے مخاطب — دنیا ہی نہیں گوش بر آوازِ محبت
شورش کہہ دنیا میں کہ دنیا ہے ہوس کی — بے وقت کی آواز ہے آوازِ محبت

وہ وقت نہ کیا آئے گا دنیا میں وفا اب
جب وقت کی آواز تھی آوازِ محبت

محفل میں ادھر اور اُدھر دیکھ رہے ہیں — ہم دیکھنے والوں کی نظر دیکھ رہے ہیں
عالم ہے ترے پرتوِ رُخ سے یہ ہمارا — حیرت سے ہمیں شمس و قمر دیکھ رہے ہیں
بھاگے چلے جاتے ہیں ادھر کو تو عجب کیا — رُخ لگ ہواؤں کا جدھر دیکھ رہے ہیں
ہوگی نہ شبِ غم تو قیامت سے ادھر ختم — ہم شام ہی سے راہِ سحر دیکھ رہے ہیں
وعدے پہ وہ آئیں یہ توقع نہیں ہم کو — رہ رہ کے مگر جانبِ در دیکھ رہے ہیں
شکوہ کریں غیروں کا تو کس منہ سے کریں ہم — بدلی ہوئی یاروں کی نظر دیکھ رہے ہیں

شاید کہ اسی میں ہو وفا خیر ہماری
برپا جو یہ ہنگامۂ شر دیکھ رہے ہیں

کیا کہئے وعدوں پہ یقیں ہم کیوں لاتے جاتے ہیں — دھوکا کھانا پڑتا ہے دھوکا کھاتے جاتے ہیں
طاقتِ ضبطِ غم دل سے رخصت ہوتی جاتی ہے — ارماں نالے بن بن کر لب پر آتے جاتے ہیں
راتیں عیش و عشرت کی دن دکھ درد مصیبت کے — آتی آتی ہیں جاتے جاتے جاتے ہیں
آندھیوں اور بگولوں سے کم نہیں تیرے دیوانے — خاک اُڑاتے آتے ہیں خاک اُڑاتے جاتے ہیں
آج سحر سے غیر بہت حال ترے بیمار کا ہے — افسردہ افسردہ ہیں لوگ جو آتے جاتے ہیں
میخانہ بھی پڑتا ہے شیخ کو راہِ مسجد میں — میخانے بھی آپ اکثر آتے جاتے جاتے ہیں

غیر تو ہیں پھر غیر وفا غیروں کا شکوہ ہی کیا
بدحالی کیا اپنے بھی آنکھ چراتے جاتے ہیں

غم سے اُن کے بھی جگر داغ داغ پائے ہیں — دیکھنے میں جو بشر باغ باغ پائے ہیں
دل کا حشر کیا ہوا یہ خبر نہیں مگر — اُس گلی میں سرخ سرخ کچھ سراغ پائے ہیں
ہر طرف تھے کل جہاں بلبلوں کے چہچہے — اُس چمن پہ قابض آج بوم و زاغ پائے ہیں
آدمیت؟ آجکل؟ بے زروں میں ہو تو ہو — اہلِ زر تو سب کے سب بد دماغ پائے ہیں

رات تھی برات کی ان کی ایک ایک رات
جن کے مرقد اے وفا بے چراغ پائے ہیں

الاماں غم کے ماروں کی دُنیا — چلتے پھرتے مزاروں کی دنیا
داغ روشن ہیں دن رات غم کے — میرا دل ہے ستاروں کی دنیا
تیرا دل ہے مرادوں کا گلشن — تیری دنیا بہاروں کی دنیا
ایک دنیا ہے مایوسیوں کی — تیرے امیدواروں کی دنیا

اس سے مطلب نہ رکھ اے وفا تو
یہ ہے مطلب کے یاروں کی دُنیا

لبوں پر جانِ زار آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے — یہ دُنیا اب مجھے جاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
یہ منزل کونسی ہے یا الٰہی نامرادی کی — طبیعت کچھ سکوں پاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
ہوائے قہر کا طوفاں بپا ہونے کو ہے شاید — فضائے دہر تھراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
بھیانک کس قدر ہے اُف درخشانی ستاروں کی — شبِ غم پاؤں پھیلاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
اُمید و یاس نے آپس ہی میں کر رکھی ہے سازش کیا — نہ یہ جاتی نہ وہ آتی ہوئی معلوم ہوتی ہے
خدا جانے ہو کیا تعبیر اس خوابِ پریشاں کی — زمیں گردوں سے ٹکراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

عجب کیا ہے جو اس دورِ ہوس میں اے وفا ہر شُو
محبت ٹھوکریں کھاتی ہوئی معلوم ہوتی ہے

حقیقت میں یاب محبت نہیں — وہ دل جو خرابِ محبت نہیں

نہیں ہر بشر لذتِ غم کا اہل — کہ ہر دل کو تابِ محبت نہیں
یہ شہرِ نگاراں ہے لے دل یہاں — محبت جوابِ محبت نہیں
ہماری نگاہوں میں کافر ہے وہ — جو اہلِ کتابِ محبت نہیں
گراں ہے مجھے مُفت بھی وہ کتاب — کہیں جس میں بابِ محبت نہیں
تغافل تو ہے حسن کی ایک ادا — تغافل حجابِ محبت نہیں
وہ خالی ہے جو دردو تاثیر سے — نوائے ربابِ محبت نہیں
محبت کا حاصل کچھ اے دوستو — بجز اضطرابِ محبت نہیں
تو سرخوش ہے اے دل جس اُمید پر — وہ تعبیر خوابِ محبت نہیں
یہ عذرِ ستم اور جو کچھ بھی ہو — مگر انقلابِ محبت نہیں
جو ڈھلتا نہیں عمر بھر وہ شباب — سوائے شبابِ محبت نہیں
قبول اے خضر مجھ کو آبِ حیات — بجائے شرابِ محبت نہیں
سرورآوری میں مئے ارغواں — حریفِ شرابِ محبت نہیں

ہے درماں پذیر اے وفا ہر عذاب
مگر ہاں عذابِ محبت نہیں

ناکامیٔ جاوید ہے انعامِ محبت — ناکامِ محبت نہیں ناکامِ محبت
وابستہ آغاز ہے انجامِ محبت — وہ صبحِ محبت تھی یہ ہے شامِ محبت
کیا ہو گئی یہ صورتِ ایامِ محبت — وہ صبحِ محبت ہے نہ وہ شامِ محبت
تھا صبحِ محبت پہ گماں شامِ اودھ کا — تھی صبحِ بنارس سے حسیں شامِ محبت
پڑتا ہے کبھی چین نہ لگتی ہے کبھی آنکھ — آفت ہے عذابِ سحر و شامِ محبت
چھوڑ آئے دلِ حسن کے اس شہر میں ہم بھی — آئے نہ جہاں سے کبھی پیغامِ محبت
ڈرتے ہیں وہ دنیا سے خدا سے نہیں ڈرتے — ڈرتے ہیں جو لیتے ہوئے الزامِ محبت

الزام محبت دو بصد شوق مجھے تم | لیتا ہوں بصد شوق میں الزامِ محبت
درکار نہیں بادۂ گلگوں مجھے ساقی | آنکھوں سے پلادے تو فقط جامِ محبت

ہشیار خبردار کہ یہ دامِ ریا ہے
سمجھا ہے جسے تو نے وفاؔ دامِ محبت

بقید یک قافیہ

بات کچھ دل کی تو کیا بن پائے گی | ہاں ہماری جان پر بن جائے گی
موت کو آنا ہے اک دن آئیگی | جان کو جانا ہے آخر جائے گی
سو تو جائے گا اجل کی گود میں | آنکھ تو بیمار کی لگ جائے گی
آپ رو رو کر منائیں غیر کو | یہ قیامت کس سے دیکھی جائے گی
اور کوئی خدمت اے ناصح بتا | میکشی ہم سے نہ چھوڑی جائے گی

ہچکیوں میں کٹ گیا دن اے وفاؔ
سسکیوں میں رات بھی کٹ جائے گی

اللہ رے کیف لمس کسی پائے ناز کا | ہے عرش پر دماغ جبینِ نیاز کا
سو عارضوں کا عارضہ ہے سالِ خوردگی | عمرِ دراز نام ہے مرگِ دراز کا
ہوتے ہی ہوتے ہو گی حقیقت ظہوریاب | اٹھتے ہی اٹھتے اٹھے گا پردہ مجاز کا
مغرب سے اٹھ کے آئی ہے برسات کی گھٹا | فتوی حرم سے لائی ہے مے کے جواز کا
اے شیخ بندگی کا سلیقہ تو سیکھ لے | ہو جا نیاز مند کسی بے نیاز کا
مستی میں بے درنگ تک اٹھا تو کیا عجب | منصور یوں بھی اہل نہ تھا ضبطِ راز کا

رکھتے تو ہیں نگاہ میں وہ اے وفاؔ مجھے
میں کیوں گلہ کروں ستمِ امتیاز کا

گو قیامت سے پیشتر نہ ہوئی — تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی
آ گئی نیند سُننے والوں کو — داستانِ غم کی مختصر نہ ہوئی
خون کتنے ستم کشوں کا ہوا — آنکھ اُس سنگدل کی تر نہ ہوئی
اُس نے سُن کر بھی اَن سُنی کر دی — موت بھی میری معتبر نہ ہوئی
ساتھ تقدیر نے کبھی نہ دیا — کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی
چین کی جستجو رہی دن رات — زندگی چین سے بسر نہ ہوئی

مجھ کو ملتی نہ اے وفا منزل
عقل قسمت سے راہبر نہ ہوئی

نالۂ دل رسا نہیں ہوتا — رام وہ دل رُبا نہیں ہوتا
تُو وفا آشنا نہیں ہوتا — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
جب نہ ہوتا تھا غم جدا دل سے — غم سے اب دل جدا نہیں ہوتا
دل ہے اُس درد کا تمنائی — چارہ جس درد کا نہیں ہوتا
جب وہ بت قہرناک ہوتا ہے — پھر خدا بھی خدا نہیں ہوتا
اہلِ زر با خدا نہیں ہوتے — بے زروں کا خدا نہیں ہوتا
شبِ تیرہ ہی کیوں ہوئی بدنام — روزِ روشن میں کیا نہیں ہوتا
کس زمانے میں کیا نہ ہوتا تھا — کس زمانے میں کیا نہیں ہوتا
عشق زود اعتماد ہوتا ہے — حُسن زود آشنا نہیں ہوتا

مہرباں پا کے بھی وفا ان کو
حسرتِ مطلب ادا نہیں ہوتا

دل کی تسکین کا آسرا نہ ہوا — ستم ان کا کرم نما نہ ہوا
میرے نالوں سے ہل گئے افلاک — تیرے دل پر اثر ذرا نہ ہوا

زخم وہ کیا جو بھر گیا آخر
درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

ٹیس دل کی کبھی فرو نہ ہوئی
ہائے دل سے کبھی جدا نہ ہوا

تیغ جب امتحان کی اٹھی
کوئی آگے مرے سوا نہ ہوا

تو نہ چاہے تو اور بات ہے یہ
تو نے چاہا اگر تو کیا نہ ہوا

تیرے دل کی گرہ ہے وہ عقدہ
آج تک جو کسی سے وا نہ ہوا

تار ٹوٹا ترے تغافل کا
ہٹ گیا میں تو کچھ بُرا نہ ہوا

دیر اس نے کبھی کی تو آنے میں
صبر تجھ سے کبھی اے وفا نہ ہوا

بے عطف و اضافت

دل نہ لے کیوں بلائیں تمہاری
دل رُبا ہیں ادائیں تمہاری

تم کو دلشاد رکھے زمانہ
آئیں ٹھنڈی ہوائیں تمہاری

راہ تکتے ہیں ساون کے جھولے
منتظر ہیں گھٹائیں تمہاری

خون میں ہم کو نہلائیں گی اب
غیر سے التجائیں تمہاری

غیر سے شوخیاں برملا ہیں
کیا ہوئیں وہ حیائیں تمہاری

بدگمانی ہے تم کو ہمیں سے
جو قسم بھی نہ کھائیں تمہاری

تم ہماری وفا آزماؤ!
ہم جفا آزمائیں تمہاری

اُٹھ چکا اس نزاکت پہ خنجر
بیٹھو باہیں دبائیں تمہاری

گائی جاتی ہیں غزلیں وفا کی
بندھ رہی ہیں ہوائیں تمہاری

بے عطفِ اضافت

ہنستے ہنستے خفا ہو گئے تم — یک بیک کیا ہے کیا ہو گئے تم

اس کو سکھ کا نہ اک سانس آیا — جس کے دکھ کی دوا ہو گئے تم

آئینہ ہے جبیں بے دلی کا — کس کے درد آشنا ہو گئے تم

اور ہی ہے ادا برہمی کی — اور بھی دلربا ہو گئے تم

ہاتھ کھینچا جفا سے کبھی تم نے — کس قدر باوفا ہو گئے تم

ہو گئی رب خدائی تمہاری — ہوتے ہوتے خدا ہو گئے تم

کتنے نادان ہو جو یہ پوچھتے ہو

کس پہ غش اے وفا ہو گئے تم

بقید یک قافیہ

سہہ تو پائے جفائیں تمہاری — غیر اور لے بلائیں تمہاری

تم نہ لو آئینے کی بلائیں — آؤ ہم لیں بلائیں تمہاری

چین کو بیٹھے عمر بھر کا — لے کے دم بھر بلائیں تمہاری

عمر گزری اسی آرزو میں — عمر بھر لیں بلائیں تمہاری

کچھ پریشاں ہیں گیسو تمہارے — کس نے لی ہیں بلائیں تمہاری

تا قیامت نہ یہ خواب ٹوٹے — لے رہا ہوں بلائیں تمہاری

شعر گائے ہیں کے ہیں وفا کے

یوں بھی لی ہیں بلائیں تمہاری

بے عطف و اضافت

مر کے غم سے رہا ہو گئے ہم
اپنے مشکل کشا ہو گئے ہم

موت کو چاہیئے تھا بہانہ
عشق میں مبتلا ہو گئے ہم

لیجئے نام کس کس ادا کا
ہر ادا پر فدا ہو گئے ہم

تم سے مل کر یہ عالم ہے اپنا
جیسے خود سے جدا ہو گئے ہم

ضبط نے اور ہی گل کھلایا
سر بسر التجا ہو گئے ہم

کل روا ہر تمنا تھی اپنی
آج کیوں نا روا ہو گئے ہم

آسرا ہے فقط اب خدا کا
کتنے بے آسرا ہو گئے ہم

مُنہ سے سرکار رہے ہو کفن کیا
جاؤ تم سے خفا ہو گئے ہم

فیدی سمجھو اسے مے کشی کا
اے وفا بے ریا ہو گئے ہم

رہی وقفِ عذاب اے ہم نشیں جانِ حزیں برسوں
سہے گا کوئی کیا جو سختیاں ہم نے سہیں برسوں

نکلنا تھا نہ نکلا اخترِ تقدیر گردش سے
دعائیں مدتوں مانگیں مناجاتیں بھی کیں برسوں

مری تاریک دنیا ہے وہ دنیا یاس و حرماں کی
جہاں اُمید کی صورت نظر آتی نہیں برسوں

وہ سازش غیر کے ایما، پہ تھی شیخ و برہمن کی
جو دیکھی ہے مری آنکھوں نے جنگِ کفر و دیں برسوں

وفا بعد فنا بھی دل کی بے تابی نہ جائیگی
نظر آئے گی لرزاں میرے مرقد کی زمین سوں

بہت آغاز دیکھے ہیں بہت انجام دیکھے ہیں
بہت نقشے نئے اے گردشِ ایام دیکھے ہیں
رپٹ جن صوفیوں کی ہے میری بدخودشی کی
کچھ انہیں ہم پیالہ دوستوں کے نام دیکھے ہیں
یہ عالم عالمِ امکاں ہے ممکن ہے یہاں یہ بھی
زبوں آغاز بھی اکثر نکو انجام دیکھے ہیں

بقید یک قافیہ - بے عطف و اضافت

نہیں نہیں نہیں اب وہ پلٹ کے آنے کا
زمانے والوں میں چرچا ہے جس زمانے کا
نہیں نہیں وہ نہیں جس کا خواب دیکھا تھا
کچھ اور رنگ ہے بدلے ہوئے زمانے کا
ہمہ غرور سراپا فتور - محض فجور
خدا سے دور ہے انسان اس زمانے کا
تری فضول سرائی سے اٹھتا ہے یہ سوال
کہ تو عجوبہ ہے اے شیخ کس زمانے کا
مرے ترانے میں ہے تان ہر زمانے کی
مرا ترانہ ترانہ ہے ہر زمانے کا
رہیں گے ہو کے زمانے کی بے رخی کا شکار
جو لوگ رخ نہیں پہچانتے زمانے کا

نہ اس لئے ہو وفا کے کمال سے منکر
کہ یہ غریب ہے شاعر ترے زمانے کا

یہ لائے ہیں اس گلی میں جا کر
ہم آئے ہیں خون میں نہا کر
وہ دل کبھی چرا کے لے گیا ہے
گزرا جو ابھی نظر چرا کر
تیرا پتہ ان سے کون پوچھے
خود کھو گئے جو تجھ کو پا کر
اک کھیل ہے بت گری ازل کا
یہ توڑنا بت بنا بنا کر
ڈھلنے کی نہیں شبِ غم اے دل
سو جایئے شمعِ جان بجھا کر

ہو جائیں گے بے نقاب اغیار　　پچھتاؤ گے مجھ کو آزما کر
جانے والا نہ واپس آیا　　رخصت ہوئے لوگ رو رلا کر
جانا ہے وہیں ہمیں بھی اک دن　　آیا نہ جہاں سے کوئی جا کر
در آئے چمن میں کس کے وحشی　　کیوں ہنس پڑے پھول کھل کھلا کر
کر لیتے ہیں اپنا غم غلط ہم　　غم کے درد بھرے گیت گا کر
ہوتے نہیں دے دلا کے بھی اب　　ہوتے تھے جو کام مل ملا کر

یہ بات ہے پست ہمتی کی
قسمت کا گلہ نہ اے وفا کر

یوں سعیٔ حصول مدعا کر　　آرام کو خود پہ ناروا کر!
خواہاں ہے جس انقلاب کا تو　　اُٹھ آپ ہی اس کی ابتدا کر
دردِ دلِ خلق کی دوا بن　　پیدا دلِ درد آشنا کر
جمہور کے دل کا ترجماں ہو　　جمہور کو اپنا ہمنوا کر
کہنے کی بات برملا کہہ　　کرنے کا کام برملا کر
ہر حق جرأت سے مانگ اپنا　　ہر فرض خلوص سے ادا کر
دل سے اٹھتی ہوئی صدا کو　　فوراً ممنونِ اعتنا کر
کافر ہے عقلِ مصلحت بیں　　زنہار نہ اس کو رہنما کر

امیدِ وفا وفا بتوں سے
اے مردِ خدا خدا خدا کر

معذور ہیں ہم کہتے چلے جاتے ہیں اگر ہم　　کیوں کر رہیں خاموش کہ رکھتے ہیں نظر ہم
ہونا ہے جو کچھ اس کا بھی لیتے ہیں اثر ہم　　ہونا ہے جو کچھ اس کی بھی دیتے ہیں خبر ہم
بس وعدے ہی وعدے ہیں یہ سو بار کے وعدے　　کب تک انہیں ہر روز سنیں بار دگر ہم

دشمن کو بھی وہ حال نہ پیش آئے خدایا ۔۔۔ دن عمر کے جس حال میں کرتے ہیں بسر ہم
حالات کی اصلاح تو ہے دور کی اک بات ۔۔۔ حالات کو پہلے سے کبھی پاتے ہیں بتر ہم
مرجھائے ہوئے چہروں پہ سہمی ہوئی آنکھیں ۔۔۔ ہر سمت یہی دیکھتے ہیں شام و سحر ہم
ہوتا ہے اگر عرضِ ستم پر تو بلا سے ۔۔۔ ہو جائے مزاج اُس ستم ایجاد کا برہم

ظاہر ہے وفا صورتِ احوالِ چمن سے
ہونے کو ہے اب نظمِ چمن درہم و برہم

ہم رعبِ حسنِ یار سے تتلا کے رہ گئے ۔۔۔ شکوے زباں تک آئے مگر آ کے رہ گئے
آیا نہ کوئی بے کے خطِ شوق کا جواب ۔۔۔ سب نامہ بر نہ جانے کہاں جا کے رہ گئے
ایفائے وعدہ کا نہ دلا پائے وہ یقین ۔۔۔ کھائی ہوئی تھی ایک قسم کھا کے رہ گئے
وہ پھول میری آرزوؤں کی ہیں اک مثال ۔۔۔ کھلنے سے پیشتر ہی جو مرجھا کے رہ گئے
شامل وہ کارواں میں ہوئے کس بساط پر ۔۔۔ جو لوگ راستے ہی میں سستا کے رہ گئے
نغمہ تو اک طرف نہ ہوا نالہ بھی رواں ۔۔۔ سب تارِ سازِ شوق کے تھرا کے رہ گئے
یوں سا لگا کہ مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا ۔۔۔ جب عرضِ مدعا پہ وہ شرما کے رہ گئے
محفل میں کر رہے تھے وہ غیروں سے شوخیاں ۔۔۔ مجھ پر پڑی نگاہ تو شرما کے رہ گئے

اُٹھے نہ بے کے دعوئے عظمت جو لے وفا
اجداد کے عروج پہ اترا کے رہ گئے

ماضی کی یادگار یہ آ جا کے رہ گئے ۔۔۔ دل پر جو داغ خونِ تمنا کے رہ گئے
ذکرِ خدا ہے اور نہ فکرِ معاش ہے ۔۔۔ ہم عاشقی میں دین نہ دنیا کے رہ گئے

ساعتوں کی نہیں بات لمحوں کی ہے ۔۔۔ جسم سے روح پرواز کر جائے گی
تم ہماری خبر کو تو کیا آؤ گے ۔۔۔ اب تمہیں کو ہماری خبر جائے گی

جس قیامت سے واعظ ڈراتا ہے تو ۔۔۔ اُس قیامت سے کم وہ قیامت نہیں

بار ہا دل پہ گزری ہے جو ہجر میں
بار ہا جان پر جو گزر جائے گی

میرے درماں گرو میرے تن پہ درد
جاؤ تم کس لئے نیند کھوٹی کرو

ہجر کی رات لا انتہا رات ہے
یہ قیامت نہیں جو گذر جائے گی

میرے جینے نہ جینے میں کیا فرق ہے
میرا جینا نہ جینا برابر ہے اب

مجھ کو مرنے ہی دو مجھ کو مرنے ہی دو
میرے مرنے سے دنیا نہ مر جائے گی

میری دنیا مری زندگی تک ہی ہے
اور اک دن مری موت کے ساتھ ہی

خاتمہ میری دنیا کا ہو جائے گا
میری دنیا مرے ساتھ مر جائے گی

ڈرنے والوں کو دنیا ڈراتی رہی
ڈرنے والوں کو دنیا ڈراتی رہے

تم ڈروگے نہ دنیا سے لیکن اگر
ہار کر تم سے دنیا ہی ڈر جائیگی

الاماں الاماں الحذر الحذر
الاماں الحذر تیری نیچی نظر

تیر بنکر جگر میں اتر جائے گی
درد کی ٹیس رگ رگ میں بھر جائیگی

لا تنگی رنگ لا تنگی آہیں مری
رائیگاں ہی نہ جائیں گی آہیں مری

میری قسمت تو سنورے نہ سنورے مگر
زلف تو اس پری کی سنور جائیگی

زندگی کو نہ ہے آرزو کو بقا
حسرت آگیں ہے دونوں کا حشر آہ وفا

زندگی آرزو میں گزر جائے گی
آرزو دل میں گھٹ گھٹ کے مر جائیگی

✻

ایسے انقلاب اکثر رائیگاں ہی جاتے ہیں
جو نظامِ عالم میں قسط وار آتے ہیں

بد اصولی بد باطن بد چلن وطن دشمن
جب بھی دندناتے تھے اب بھی دندناتے ہیں

خون دینے والوں کو پوچھتا نہیں کوئی
دودھ پینے والے اب مرتبے بھی پاتے ہیں

دشمنوں سے ہو آگہی جو کبھی نہ کھاتے ہم
دوستوں سے دانستہ وہ فریب کھاتے ہیں

✻

رواں نغموں کا اس سے خود بخود سیلاب ہوتا ہے
رباب حریت کب تشنۂ مضراب ہوتا ہے

بڑی دلکش ہے آزادی کے گلشن کی فضا لیکن
یہ گلشن زندگی کے خون سے شاداب ہوتا ہے

اگر چھوٹا ہوا ہو جی تو ڈر لگتا ہے ساحل سے
قوی ہو دل تو بحرِ بیکراں پایاب ہوتا ہے

ٹپک پڑتا ہے جو یادِ وطن میں چشمِ محزوں سے
وہ قطرہ اشک کا رشکِ دُرِ نایاب ہوتا ہے

اس سے کوئی بحث نہیں کیا کیا — جو بھی کیا آپ نے اچھا کیا
تجھ کو ترے حسن سے شہرت ملی — مجھ کو میرے عشق نے رسوا کیا
حق نے تجھے عشرتِ امروز دی — مجھ کو رہینِ غمِ فردا کیا
کس سے ہوا ترکِ تمنا یہاں — کس نے یہاں ترکِ تمنا کیا

ملنا مقدر کا بھی کیوں کر مجھے — میں نے محبت کا نہ سودا کیا
وعدہ ترا شام کو آنے کا تھا — راہ تیری صبح سے دیکھا کیا
فرطِ عقیدت سے وہ شوق میں — سجدہ بہرِ نقشِ پا کیا
دشمنوں کو دشمنوں سے شکوہ کیوں — دوستوں نے دوستوں سے کیا کیا
مجھ کو جلاتی رہی غم کی جو آگ — آخر اسی آگ نے ٹھنڈا کیا
وعدوں پر اس کے ہے مدارِ حیات — جس نے کوئی وعدہ نہ پورا کیا
کیا برا تھا ایک نظر کا سوال — آپ نے دل کس لئے چھوٹا کیا
پیروؤں کی محنتیں اکارت گئیں — رہبروں نے اپنا ہی چاہا کیا
جاہلوں نے دل کی لگن کے طفیل — عاقلوں سے جو نہ ہوا تھا کیا
تاب اگر دید کی اسے دل نہ تھی — دید کا کیوں اس نے تقاضا کیا

میری گراں جانیوں نے اسے دیکھا
پھر ملک الموت کو حیلت گیا

قہقہے غیروں کے ہیں آٹھوں پہر
آفت جاں ہے تری ہمسائیگی
موت بن کر آئے گا دل کا قرار
جان لے کر بے قراری جائے گی

❖

اس کا گلہ بجا کہ زمانہ بدل گیا
اس کا علاج کیا کہ زمانہ بدل گیا
ساقی شراب لا کہ زمانہ بدل گیا
مطرب غزل سنا کہ زمانہ بدل گیا

❖

غلط کہتے ہیں جو کہتے ہیں ایسا ہو نہیں سکتا
اُسی کے ہو گئے سب جو کسی کا ہو نہیں سکتا

❖

شیخ جی یہ صفائیاں توبہ
پی پلا کر برائیاں توبہ

❖

نظمیات

کشمیر جنت نظیر

یہ ہے رنگیں بہاروں کی دنیا
رُوح پرور نظاروں کی دنیا
وادیوں کوہساروں کی دنیا
ندیوں جوئباروں کی دنیا
عنبریں شاخساروں کی دنیا
گُل زمیں راہگزاروں کی دنیا
دل کشا مرغزاروں کی دنیا
جاں فزا آبشاروں کی دنیا
گُل رُخوں گُل عذاروں کی دنیا
مہوشوں ماہ پاروں کی دنیا
حُسن کے تاجداروں کی دنیا

عظمتِ وطن

رشکِ ایران و مصر و یمن اے وطن　　غیرتِ روم و شام و عدن اے وطن
دلکش و دلکشا ہیں فضائیں تری　　اور تو ہے سراپا چمن اے وطن
دلنشیں تر گلستانِ جنت سے ہے　　تیری آب و ہوا تیرے تن اے وطن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

آفتابِ تمدن کی پہلی کرن　　تیرے رخ پر ہوئی ضو فگن اے وطن
ہر زمانے میں دنیا کو تو نے دیئے　　ماہرِ علم یکتائے فن اے وطن
شہرہ جن کی شجاعت کا دنیا میں ہے　　ان شجاعوں کا تو ہے وطن اے وطن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

جان و دل سے ہیں تیرے پرستار سب　　طفل و پیر و جوان مرد و زن اے وطن
تیری خدمت کی رکھتا ہے دل میں لگن　　شیخ ہے کوئی یا برہمن اے وطن
تیری بہبود ہے سب کو مدِ نظر　　تجھ سے پیارا ہے تن من نہ دھن اے وطن
اے وطن اے وطن اے وطن اے وطن

ابرِ بہار آ

خلقِ خدا ہے تیرے لئے بیقرار آ　　مور و طیور کو ہے ترا انتظار آ
تکتا ہے کب سے راہ تری بادہ خوار آ　　بیتاب ہے گدائے سرِ راہ گذار آ
محوِ دعا ہے زاہدِ شب زندہ دار آ　　دہقان کی نگاہ ہے یاس آشکار آ
ہر دل سے اٹھ رہی ہے صدا بار بار آ　　ہر لب پر التجا ہے بصد انکسار آ
پھیلائے دامنوں کو ہیں امیدوار آ　　لے کر پیامِ رحمتِ پروردگار آ

موتی بکھیرتا ہوا ابرِ بہار آ

گرمی سے مضطرب ہے بہت جانِ زار آ
تجھ پر ہے زندگی کا بس اب انحصار آ

حسرت فزا ہے منظرِ شہر و دیار آ
عالم ہے سارا عالمِ گرد و غبار آ

دقفِ غم و ملال ہیں نیل و نہار آ
اے باغ و دشت و کوہ کے شاداب کار آ

مرجھا گئے ہیں شاخ و گل و برگ و بار آ
پیاسا کھڑا ہے سرِ لبِ جوئبار آ

صورت دکھا کے لوٹ نہ جا یار بار آ
آنے میں اور دیر نہ کر زینہار آ

آ اور آنے کی طرح ابرِ بہار آ

پھر دھوپ ہو چلی ہے بہت ناگوار آ
پھر پتھروں سے اڑنے لگے ہیں شرار آ

نکلا نہیں زمیں کے دل کا بخار آ
بیٹھا نہیں غبارِ سرِ راہگزار آ

مشرق سے جھومتا ہوا مستانہ وار آ
مغرب سے اُٹھ کے دوشِ ہوا پر سوار آ

آخری بند کے سارے شعر رفا صاحب کو یاد نہ آسکے ورنہ یہ بند بھی پہلے دونوں بندوں جیسا مترنم اور زوردار تھا۔

جمہوریت

ضامنِ بہبودِ خاص و عام ہے جمہوریت
عافیت کا ایزدی پیغام ہے جمہوریت

شاہکارِ حکمتِ ایام ہے جمہوریت
پاسدارِ حرمتِ اقوام ہے جمہوریت

تقویت ملتی ہے جس سے قومیت کی روح کو
حریت کا وہ مفرح جام ہے جمہوریت

تابعِ ماحولِ استحکام ہے آسودگی
خالقِ ماحولِ استحکام ہے جمہوریت

سرفروشانِ وطن کے لامثال ایثار کا
بیش قیمت بے بہا انعام ہے جمہوریت

شرط ہے صدق و صفا جمہوریت کے واسطے
ورنہ اک مکر و ریا کا دام ہے جمہوریت

دشمنِ جمہوریت ہیں وہ حریصِ اقتدار
جن کے باعث ملک میں بدنام ہے جمہوریت

جان سکتے ہیں کہاں یہ زرپرست ابنائے وقت | کیا بلا ہے کس بلا کا نام ہے جمہوریت

ہاں یہی خودکام اور بدکام ہیں اس کا سبب | ہند میں اب تک اگر ناکام ہے جمہوریت

مُنہ دکھا سکتے ہیں جبتک عام لوگوں کو یہ لوگ

خوابِ موہوم و خیالِ خام ہے جمہوریت

شہر آشوب

کیا کہئے کہ کیا شام و سحر دیکھ رہے ہیں | رنگِ فلکِ شعبدہ گر دیکھ رہے ہیں

حیرت سے اِدھر اور اُدھر دیکھ رہے ہیں | ماحولِ جہاں زیر و زبر دیکھ رہے ہیں

شوریدگیِ دَورِ قمر دیکھ رہے ہیں | ہر سمت بپا فتنہ و شر دیکھ رہے ہیں

اشراف کو خاشاک بسر دیکھ رہے ہیں | اشرار کو منظورِ نظر دیکھ رہے ہیں

وہ صورتیں بھی کرسیوں پر دیکھ رہے ہیں | جن میں کوئی سگ اور کوئی خر دیکھ رہے ہیں

نیلام پر ایمانِ بشر دیکھ رہے ہیں | ہر فرد کو دیوانۂ زر دیکھ رہے ہیں

مٹتے ہوئے اقدارِ ہنر دیکھ رہے ہیں | جلتے ہوئے مٹی میں گہر دیکھ رہے ہیں

حسرت زدہ ایک ایک نگر دیکھ رہے ہیں | افلاس میں ڈوبے ہوئے گھر دیکھ رہے ہیں

محنت کشوں کا حال بتر دیکھ رہے ہیں | چہروں پہ فلاکت کا اثر دیکھ رہے ہیں

خطرات سے پُر سیر و سفر دیکھ رہے ہیں | مخدوش ہر اک راہ گزر دیکھ رہے ہیں

القصہ جو کچھ پیشِ نظر دیکھ رہے ہیں | ہم دیکھ نہیں سکتے مگر دیکھ رہے ہیں

دم بستہ و با دیدۂ تر دیکھ رہے ہیں

شہیدانِ وطن

سلام اے شہیدانِ جنت مقام | بڑھایا ہے تم نے وقارِ وطن

خوشی سے وطن کیلئے جان دی
خوشی سے ہوئے تم نثارِ وطن!
سپہر وطن کے ستارے ہو تم
منوّر ہے تم سے دیارِ وطن
بہاریں ہیں جن سے وطن کی فضا
تمہیں ہو وہ شادابِ کارِ وطن
تمہاری شہادت کے اعجاز سے
طرب زا ہے لیل و نہارِ وطن
تمہاری ہی جانبازیوں کے طفیل
ہے اونچا سرِ افتخارِ وطن

سرزمین پنجاب کی

واہ وا کیا پُر فضا ہے سرزمیں پنجاب کی
پُر فضا ہے دلکشا ہے سرزمیں پنجاب کی
گلشنِ جنت نما ہے سرزمیں پنجاب کی
بلکہ جنت سے سوا ہے سرزمیں پنجاب کی
رُوح پرور جاں فزا خاطر نشیں کیف آفریں
بے حد و بے انتہا ہے سرزمیں پنجاب کی
فیضِ قدرت سے شفا تاثیر ہے اس کی ہوا
قدرتی دار الشفا ہے سرزمیں پنجاب کی
انتخابِ کائناتِ آب و گِل ہے ایشیا
انتخابِ ایشیا ہے سرزمیں پنجاب کی
مردِ میدانِ وغا ہے ہر مکیں پنجاب کا
ارضِ میدانِ وغا ہے سرزمیں پنجاب کی
بحقیقت ہے یہ پیداوار کی ہنات ہیں
ملک بھر کی رہنما ہے سرزمیں پنجاب کی
سونا دھرتی سے اُگلتی ہے وہ مٹی کی جگہ
ہم نے یہ اکثر سُنا ہے سرزمیں پنجاب کی
اس کا رُخ کرتے رہے جو قحط کے مارے ہوئے
اب بھی اُن کا آسرا ہے سرزمیں پنجاب کی
جس کی ہم پلّہ نہیں دنیا کی کوئی سرزمیں
سرزمیں وہ اے وفا ہے سرزمیں پنجاب کی

جواں بیٹے کی موت

لے گئی مجھ سے سکونِ قلب و جاں بیٹے کی موت
دے گئی مجھ کو عذابِ جاں ستاں بیٹے کی موت

کس قدر تھے آہ خوش آیند مستقبل کے خواب
کس قدر تھی دور از وہم و گماں بیٹے کی موت

اس لئے دس سال پہلے ہی کنارا کر گئی
دیکھتی کس آنکھ سے باوا کی ماں بیٹے کی موت

باپ کی لیکن بھلے وقتوں میں کہتے تھے اُسے
باپ کی آنکھوں کے آگے ہو جواں بیٹے کی موت

باپ جو اکلوتے بیٹے کا ہو باپ اس کیلئے
ہے نزولِ صد بلا یکے ناگہاں بیٹے کی موت

زندگی بھر دل سے جانیکا نہیں بیٹے کا غم
زندگی بھر مجھ پہ گزرے گی گراں بیٹے کی موت

اس سے بڑھ کر بد نصیبی اور کیا ہو گی وفا
باپ کی آنکھوں کے آگے ہو جواں بیٹے کی موت

شاعرِ اعظم ٹیگور

اوجِ رفعت کس زباں سے ہو بیاں ٹیگور کا
مرتبہ ہے برتر از ہفت آسماں ٹیگور کا

حکمرانی ہے جہانِ شعر پر ٹیگور کی
مشرق و مغرب میں ہے سکہ رواں ٹیگور کا

عظمتِ شعر و ادب ہے شاعری ٹیگور کی
قائلِ عظمت ہے ہر اک نکتہ داں ٹیگور کا

ترجماں ٹیگور ہر پیر و جواں کے دل کا ہے
کیوں نہ ہو دلدادہ ہر پیر و جواں ٹیگور کا

فلسفہ بھارت کا ہے لیکن آپ ہی اپنا جواب
اور سونے پہ سہاگہ ہے بیاں ٹیگور کا

ہوتی ہے ہر دور کی تقدیر کب اتنی رسا
ہوتا ہے ہر دور میں ثانی کہاں ٹیگور کا

دین ہے یہ دینے والے کی یہ گر جس کو ملے
سب کی قسمت میں نہیں حسنِ بیاں ٹیگور کا

ہو گیا دل میں ہمیں جوشِ عقیدت موجزن
آ گیا نام اتفاقاً بھی جہاں ٹیگور کا

سجدہ کرتے ہیں جہاں سب شاعرانِ باکمال
اے وفا وہ آستاں ہے آستاں ٹیگور کا

گورو گوبند سنگھ

پیارا کلام ہے گورو گوبند سنگھ کا
سچا پیام ہے گورو گوبند سنگھ کا

اونچے اصول ہیں گورو گوبند سنگھ کے
اونچا مقام ہے گورو گوبند سنگھ کا

ہر دل میں یاد ہے گورو گوبند سنگھ کی
ہر لب پہ نام ہے گورو گوبند سنگھ کا

ہر خطۂ زمین میں ہر اقلیم دہر میں
آج احترام ہے گورو گوبند سنگھ کا

صدیوں کے بعد بھی ورقِ روزگار پر
نقشِ دوام ہے گورو گوبند سنگھ کا

حامل تمام تر ازلی خوبیوں کا ہے
کامل نظام ہے گورو گوبند سنگھ کا

جو کائروں کو ہمت و جرأت عطا کرے
وہ جام جام ہے گورو گوبند سنگھ کا

چڑیوں کو دینا بازوں سے لڑنے کا حوصلہ
یہ کام کام ہے گورو گوبند سنگھ کا

غالبؔ کی عظمت

ہر نکتہ شناس ہر سخن فہم
ہے معترفِ کمالِ غالب

اُردو کے لئے ہے مایۂ ناز
شخصیتِ بے مثالِ غالب

غالب کے دوام کی کفالت
ہے شہرتِ لازوالِ غالب

غالب کو سمجھنا ہو تو پڑھئے
حالی کی یادگارِ غالب

غالب کے کمال پر ہیں شاہد
اشعارِ آبدارِ غالب

ایسے اشعار ہیں بکثرت
کہئے جنہیں شاہکارِ غالب

خورشید و قمر پہ خنداں زن ہے
ہر ذرۂ رہ گزارِ غالب

غالب کا کلام بے بدل ہے
سرمایہ افتخارِ غالب

آرائشِ گیسوئے سخن تھا — شغلِ لیل و نہارِ غالب
حقا کہ حیات بخشِ فن تھی — طبعِ اعجاز کارِ غالب
کشافِ رموزِ معرفت تھا — کلکِ جادو نگارِ غالب
ہوتا ہے اگر تو کیا غلط ہے — پیغمبروں میں شمارِ غالب
اربابِ ذوقِ شعر کو ہے — سجدے کی جگہ مزارِ غالب

کثرتِ اولاد

دشمنِ آرام و خواب کثرتِ اولاد ہے — موجبِ صد اضطراب کثرتِ اولاد ہے
ایک ہو غم تو کوئی اس کا مداوا کرے — وجۂ غمِ بے حساب کثرتِ اولاد ہے
یورشِ افکار ہے شام و سحر جان پر — شام و سحر کا عذاب کثرتِ اولاد ہے

دشمنِ آرام و راحت کثرتِ اولاد ہے — موجبِ آلام و عسرت کثرتِ اولاد ہے
چین دن کا نیند راتوں کی اڑا دیتی ہے جو — وہ صعوبت وہ عقوبت کثرتِ اولاد ہے
اصلیت یہ ہے یہاں قلت کسی شے کی نہیں — اصلیت میں وجۂ قلت کثرتِ اولاد ہے

شہید متی داس

اے متی داس بھر آئی چشمِ جہاں — دیکھ کر آرے سے چیرا جانا تیرا
انتہا ضبط و صبر و تحمل کی تھی — حرفِ اُف تک بھی لب پہ نہ لانا تیرا

چھڑ گئیں جب شہیدوں کی باتیں کہیں — دل میں فی الفور تیرا خیال آگیا
تو کھڑا جب ہوا جا کے آرے تلے — تیرے چہرے پہ قدسی جلال آگیا

اس اذیت سے تیری ہلاکت ہوئی
طبعِ دوراں میں بھی اشتعال آگیا
مل گئی ظالموں کو سزا ظلم کی
مغلیہ سلطنت پر زوال آگیا

زندگی کا سفر سہل تر ہو گیا
دور جب دل سے مرنے کا ڈر ہو گیا
مر گئے مرنے والے زر و مال پر
قوم پر مرنے والا امر ہو گیا

دنیائے شہادت میں تو ہے در بر منتی داس
ہم رفعتِ افلاک ہے مینارِ شہادت
اے پیکرِ عزم و عمل اے غازیِ کردار
اے تازہ کُنِ گرمیِ بازارِ شہادت
سینہ ترا گنجینۂ اسرار و معارف
چہرہ ترا آئینۂ اقدارِ شہادت
شاداب جسے تو نے کیا اپنے لہو سے
شاداب ہے اب تک بھی وہ گلزارِ شہادت
دم بھر کیلئے رُک گئے ہاتھ آرا کشوں کے
اُبھرے ترے چہرے پہ وہ انوارِ شہادت
رکھنے کے لئے تاجِ شہادت ترے سر پر
جنت میں سجایا گیا دربارِ شہادت
تحسین کے پھولوں کی ہوئی عرش سے بارش
حوروں نے بندھائی تجھے دستارِ شہادت

امدادِ باہمی

اب ضرورت کچھ نہیں اس مسئلے پر بحث کی
تا کہ اب چھوٹا بڑا سمجھے باہمی امداد کا
مذہب و ملت نہ نسل و رنگ کا ہی امتیاز
ہر کسی پر در کھلا ہے باہمی امداد کا
منزلِ مقصود پر جس سے پہنچتا ہے بشر
وہ یقینی راستہ ہے باہمی امداد کا
ہر بشر کو حوصلہ دیتی ہے جس کی روشنی
وہ چراغِ راہ نما ہے باہمی امداد کا
فکر سے آزاد ہے یکسر وہ جس انسان نے
آسرا اپنا لیا ہے باہمی امداد کا

مفلسی کے رنگ سے چھٹکارا پانے کیلئے نسخۂ از بس بیجا ہے باہمی امداد کا
جلوہ آرا ہے جو یہ آسودہ حالی کی بہار حیرت افزا معجزا ہے باہمی امداد کا
ملک میں ہر سو نظر آتا ہے جو سبز انقلاب یہ کرشمہ برملا ہے باہمی امداد کا
ہاں یہ ہر شے کی فراوانی نتیجہ بالیقین باہمی امداد کا ہے باہمی امداد کا

بیت ⁕ بیت

افلاس کا علاج ہے امدادِ باہمی درمانِ احتیاج ہے امدادِ باہمی

بیت × بیت

علم میں قومیں بڑھی ہیں باہمی امداد سے بام رفعت پر چڑھی ہیں باہمی امداد سے

بیت × بیت

دنیا میں آدمی کا محتاج آدمی ہے بنیادِ آدمیت امدادِ باہمی ہے

بیت ⁕ بیت

غیروں سے نہیں شیر و شکر دیکھ رہے ہیں برسوں سے یہی شام و سحر دیکھ رہے ہیں
قیمت کی گرانی کہ ملاوٹ ہو کہ ہر شکل ہر شئے پہ کرپشن کا اثر دیکھ رہے ہیں

بیت - بیت

کلٹو سے محبت کا ثمر دیکھ رہے ہیں بکھٹو کو پھر آمادۂ شر دیکھ رہے ہیں
ہر جنبش لب میں ہے نئی جنگ کی دھمکی ہر سانس سے بارانِ شرر دیکھ رہے ہیں
کشمیر میں گھس بیٹھ کی تیاریوں کے ساتھ ڈنڈ پیلتے ٹکا کو ادھر دیکھ رہے ہیں

بیت - بیت

سوچ دل میں دوست کے دشمن سے کیسی دوستی
دشمنی ہے دوست سے اے دوست ایسی دوستی

شرافت خون روتی ہے نجابت ہاتھ ملتی ہے
خیانت ہی جہاں میں پھولتی ہی اور پھلتی ہے

بیت ٭ بیت

اندرا نے کچل کر اسے رکھ دیا
فتنہ اٹھا تھا جو ارضِ ناپاک سے
پیکرِ کبر و نخوت جو یحییٰ تھا کل
آج ہے ہیچ تر ذرہ خاک سے

بیت ٭ بیت

نئی اک جنگ مطلب ہے میاں بھٹو کی باتوں کا
میاں بھٹو بھی یحییٰ کی طرح ہے بھوت لاتوں کا

بیت ٭ بیت

نہ بھولے گا نہ بھولے گا قیامت تک نہ بھولے گا
سکھایا جو سبق بھارت نے وحشی جنگ بازوں کو
بہادر شیر دل شمشیر زن ہندی جوانوں نے
گرایا سر کے بل شوریدہ سر گردن فرازوں کو

بیت ٭ بیت

اے کوسی گن اے نازشِ دنیائے سیاست
شہرہ ہے زمانے میں تری دیدہ وری کا
اس بات کی توفیق تجھے کیوں نہیں ہوتی
چارہ کرے ایوب کی بے راہ روی کا

بیت ٭ بیت

لا رہی ہی بربریت رنگ یحییٰ خان کی
کھد رہی ہے قبر بنگالے میں پاکستان کی

بیت ٭ بیت

بٹھا کر گود میں کیرتوں کو نہرو جی نے فرمایا
"تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر"

دسواں باب

سنگِ میل کا انتخاب

پوچھیں وہ کاش حالِ دلِ بے قرار کا — ہم بھی کہیں کہ شکر ہے پروردگار کا

کیوں کر مٹے ندامتِ اظہارِ آرزو — عالم نظر میں ہے نگہِ شرمسار کا

صیاد بھی پہنچ گیا گلچیں بھی باغ میں — اے ہمصفیر آگیا موسم بہار کا

رکھے گا بے قرار انہیں بھی تمام عمر — مرنا تڑپ تڑپ کے کسی بے قرار کا

بے لوث ہو ہوس سے اگر عشق اے وفا
ہے ذکرِ یار میں بھی مزا وصلِ یار کا

بوسہ بھی اُس نگارِ سراپا وقار کا — دیوانہ پن ہے کام بڑے ہوشیار کا

تازہ جگر کے داغ ہوئے ہجرِ یار میں — نکھرا خزاں میں رنگ ہماری بہار کا

کیا جانے آکے جائے نہ جائے خزاں کا دَور — اور جا کے موسم آئے نہ آئے بہار کا

آنکھوں پہ ہے یقین نہ کانوں پہ اعتبار — وہ حال پوچھتے ہیں دلِ بیقرار کا

اپنے ہی دل پہ جبر کئے جا رہا ہوں میں — بس یہ ہے طول وعرض مرے اختیار کا

روداد یہ ہے مختصراً اے وفا مری
مارا ہوا ہوں گردشِ لیل و نہار کا

مشکل نہ تھا مقابلہ تمکینِ یار کا — مشکل یہ ہے کہ دل ہی نہیں اختیار کا

دل کا بھی خون بہا نہ ملا جان بھی گئی — احسان بھی رہا نگہِ شرمسار کا

آخر حریفِ عشق بنا ہے شریکِ غم — سچ ہے کہ [illegible] نہیں اعتبار کا

آئے گا چین مل کے پسِ مرگ خاک میں　　جائیگا جان لے کے مرض انتظار کا
کیفِ نشاطِ پرسشِ احوال الاماں　　ہے عرش پر دماغ دلِ بے قرار کا

موقوف کچھ مجھی پہ فقط اے وفا نہیں
دلدادہ اک جہاں ہے مرے دل تسکار کا

اُٹھا ہے سوئے دشت سے بادل غبار کا　　وحشی ترے مناتے ہیں موسم بہار کا
طوفانِ برق و باد کا موسم بھی یہ سہی　　موسم ہے پھر بہار کا موسم بہار کا
آزادیاں چمن کی ہمیں بھی نصیب تھیں　　ہم سے بھی سازگار تھا موسم بہار کا
دامن ہیں چاک چاک گریباں ہیں تار تار　　موسم جنون کا بھی ہے موسم بہار کا

دل جن کے اے وفا ہیں فسردہ مری طرح
آئے گا راس کیا انہیں موسم بہار کا

بس اب میں رات دن کی یہ اذیت سہہ نہیں سکتا
کہ سب کچھ دیکھتا ہوں اور کچھ بھی کہہ نہیں سکتا
کوئی اندیشۂ تعزیر سے کچھ کہہ نہیں سکتا
ستم وہ ہو رہے ہیں آدمی تو سہہ نہیں سکتا
جہاں میں عام ہے میرے الم کی داستاں لیکن
وہ مجھ سے سن نہیں سکتے میں اُن سے کہہ نہیں سکتا
اماں آغوشِ ساحل میں بھی اس کو مل نہیں سکتی
جو دریا میں طلاطم کے تھپیڑے سہہ نہیں سکتا
فنا آمادگی میں ہے وفا رازِ بقا پنہاں
جسے مرنا نہیں آتا وہ زندہ رہ نہیں سکتا
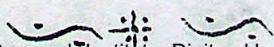
گاہ ادھر دیکھنا گاہ اُدھر دیکھنا　　آہ نہ لیکن انہیں بھر کے نظر دیکھنا
میرے لئے جُرم کیوں انجمنِ ناز میں　　ایک نفس بیٹھنا ایک نظر دیکھنا
ہم بھی تھے ہاں خوش نصیب ہم کو بھی تھا ہاں نصیب　　اُٹھتے ہی منہ یار کا وقتِ سحر دیکھنا
ہو نہ سکا ہم سے ترک کر نہ سکے ترک ہم　　راہ تری بار بار شام و سحر دیکھنا

دیکھ چکے اور تو چارۂ غم کر کے ہم
ایک فقط اے وفاؔ رہ گیا مر دیکھنا

روا ہو گیا ناروا ہو گیا　　محبت میں جو ہو گیا ہو گیا
اگر جان جاتی رہی غم نہیں　　محبت کا حق تو ادا ہو گیا
کوئی داد خواہوں کی سنتا نہیں　　وہ بُت روزِ محشر خدا ہو گیا
مرے دردِ دل کی دوا ہو گئی　　مرا دردِ دل لا دوا ہو گیا

وفاؔ جان دیتے تو ہو تم مگر
اگر وعدہ اُن کا وفا ہو گیا

کہتا ہی مرا کیا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا　　یہ بھی تمہیں دھوکا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
یہ بات کہ کہنا ہے مجھے تم سے بہت کچھ　　اس بات سے پیدا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کچھ کہہ کے جو بن جاؤں بُرا سب کی نظر میں　　اس سے یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
کہلاؤ نہ کچھ غیر کی تعریف میں مجھ سے　　سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

کہنے کا تو اپنے ہے وفاؔ آپ بھی قائل
کہنے کو یہ کہتا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

وہ کہتے ہیں یقیں لانا پڑے گا　　یہ دھوکا جان کر کھانا پڑے گا
زمانے کو بدلنا ہم نے ٹھانا　　زمانے کو بدل جانا پڑے گا
بڑا بد راہ ہے چرخِ ستمگر　　اُسے اب راہ پر لانا پڑے گا

سلامت ہے ہمارا جذبِ اُلفت　　تم آؤ گے تمہیں آنا پڑے گا

دلِ ناداں سمجھ جائے گا لیکن　　دلِ ناداں کو سمجھانا پڑے گا

عدو کے ناز اُٹھنے کون دیکھے　　تری محفل سے اٹھ جانا پڑے گا

پڑا ہے اے وفا پالا بُتوں سے
خدا کو درمیاں لانا پڑے گا

اُدھر بڑھتے بڑھتے بڑھا دستِ شوق　　اُدھر آتے آتے حجاب آ گیا

لفافے میں پُرزے مرے خط کے ہیں　　مرے خط کا آخر جواب آ گیا

ہوئی قائلِ جلوۂ طور خلق　　سرِ بام وہ بے نقاب آ گیا

زمانہ ہے کیوں مائلِ انقلاب　　زمانے میں کیا انقلاب آ گیا

عُدو ساتھ رہنے لگے اے وفا
گہن میں مرا آفتاب آ گیا

عمکدہ حیات کیا اور نشاطِ کار کیا　　جان کا اعتبار کیا موت پر اختیار کیا

دیکھی ہیں غم کی شدتیں دیکھا ہے خونِ آرزو　　اور دکھائے دیکھئے گردشِ روزگار کیا

ہم کو غرض بہار سے ہم سے غرض بہار کو　　کنجِ قفس میں چھیڑے زمزمۂ بہار کیا

مرنے کی ٹھان لی تو اب موت سے خود اُلجھ پڑیں　　کائروں کی طرح کمریں موت کا انتظار کیا

جھانک رہا ہوں بار بار پردۂ کائنات میں
دیکھ رہا ہوں غیب سے ہوتا ہے آشکار کیا

چلی تفرقے کی ایسی ہوا رنگِ چمن بگڑا　　فضائے سبزہ بگڑی منظرِ سرو سمن بگڑا

بنایا سب کو پھر کچھ اسطرح شوخیٔ پُرفن نے　　ہر اہلِ انجمن سے پھر ہر اہلِ انجمن بگڑا

بگڑ نکلی دنیا پھیلی ہے اک دل کے بگڑنے سے　　پھیوں بگڑا نظر بگڑی زباں بگڑی دہن بگڑا

نہ اب تہذیب میں شفقت نہ شوخی میں ادب باقی　　بزرگوں کی روش بگڑی عزیزوں کا چلن بگڑا

بگاڑا ایسا نہ دیکھا تھا کبھی پہلے ان آنکھوں نے
دماغ شیخ بگڑا اور مزاج برہمن بگڑا

پردہ تمہاری پردہ نشینی کا اٹھ گیا
کچھ کہنے کو ہیں یہ وا لبِ خاموشِ نقشِ پا

افتادگانِ خاک کی مٹی خراب ہے
جز گردِ راہ کچھ نہیں تن پوشِ نقشِ پا

احوالِ رفتگانِ عدم کس سے پوچھئے
تابِ سماع رکھتے نہیں گوشِ نقشِ پا

گزری وفاؔ جو مجھ پہ رہِ کوئے دوست میں
شاہد ہیں اس کے دیدۂ خاموشِ نقشِ پا

زباں سے تو کچھ بھی نہ کہہ پائے ہم
نگاہوں سے سب کچھ عیاں ہو گیا

خدا کی بڑی مہربانی ہوئی
کہ مجھ پر وہ بت مہرباں ہو گیا

وفاؔ کو تھا بچپن سے آزارِ عشق
تعجب ہے کیوں کر جواں ہو گیا

وفورِ یاس میں یہ بھی مآل کار کیا
رقیب کو غمِ اُلفت کا رازدار کیا

سبب ہے دشمنوں سے میری مات کھانے کا
یہی کہ دوستوں پر میں نے انحصار کیا

کسی کے پاؤں پہ سر رکھ دیا وفاؔ ہم نے
بڑا ہی عرضِ تمنا میں اختصار کیا

ارمان مدتوں میں نکلتا ہے دید کا
دل دار بن کے ہو گئے تم چاند عید کا

ہو آتے ساتھ آپ بھی دو چار دس قدم
لے جا رہے ہیں لوگ جنازہ شہید کا

ٹھوکر کو اتفاق نہ گردانیئے حضور
رُک جائیے مزار یہی ہے شہید کا

اشرار دوستی میں ہے اشرافِ دشمنی
قاتل حسین کا ہے معاون یزید کا

قدریں مٹائی جاتی ہیں عہدِ قدیم کی
آئین بن رہا ہے نظام جدید کا

آموزگارِ کفر ہو جب پیر کا چلن
ایمان کیا رہے گا سلامت مرید کا

ہوتی تھی جب بسر تری صحبت میں رات دن
ہر رات تھی برات کی ہر دن تھا عید کا

آنکھیں بھی دیکھتی ہیں زمانے کے رنگ ڈھنگ — دل بھی سمجھ رہا ہے زمانہ بدل گیا
بدلا نہ تھا زمانہ اگر تم نہ بدلے تھے — اب تم بدل گئے تو زمانہ بدل گیا
اُن کو دلائیں یاد جب اگلی عنایتیں — وہ بھی یہ کہہ اُٹھے کہ زمانہ بدل گیا
یہ بھی سنیں کہ آپ کی عادت بدل گئی — یہ تو بہت سنا کہ زمانہ بدل گیا

بس ایک اے وفا مرے مٹنے کی دیر تھی
مجھ کو مٹا چکا تو زمانہ بدل گیا

دیا بھی تو دل کس دل آزار کو — لیا بھی تو کیا عمر بھر کا عذاب
نشاطِ شب و روز تجھ کو نصیب — مرا حصہ شام و سحر کا عذاب

مقدر رہا ہے زردوں کو وفا
ہوا خواہیِ اہلِ زر کا عذاب

ہاں غیرتِ خورشید ہیں اور رشکِ قمر آپ — ماحول چمک اُٹھتا ہے جاتے ہیں جدھر آپ
قائم یہ ہے دائم رہے یہ حسن کا عالم — دیکھیں نہ کبھی شامِ جوانی کی سحر آپ
کیا مر کے بھی اب جینے نہ دینگے مجھے اعدا — کیوں آئے مری گور پہ با دیدۂ تر آپ

آخر کوئی حد بھی ہے وفا بوالعجبی کی
رکھتے ہیں شبِ ہجر میں امیدِ سحر اب

کچھ نہ کچھ ہوگا مری مشکل کا حل فرقت کی رات — تم نہ آؤگے تو آئیگی اجل فرقت کی رات
مر دسرد آہوں سے یوں آنسو مرے جمنے گئے — ہو گیا تعمیر اک موتی محل فرقت کی رات
کچھ نہیں کھلتا کہ آخر اس قدر لمبی ہے کیوں — وصل کے دن کا ہے جب ردِ عمل فرقت کی رات
صبح کا منہ دیکھنا میرے مقدر میں نہ تھا — میرا اندیشہ نہ تھا کچھ بے محل فرقت کی رات

صبح کا منہ دیکھنا میرے مقدر میں نہ تھا
میرا اندیشہ نہ تھا کچھ بے محل فرقت کی رات

دھواں چھا گیا ادرِ افلاس کا — بڑھے جس قدر کارخانے بہت
تلاشِ جوازِ ستم کیا ضرور — اگر خو بُری ہو بہانے بہت
یہ سنتے رہے ہر زمانے میں ہم — کہ اچھے تھے اگلے زمانے بہت
نہیں تیرے کوچے میں جینا نصیب — تو مرنے کے ہم کو ٹھکانے بہت
ہوا اندھا ہی کوئی تو بیٹھے یہاں
تری انجمن میں ہیں کانے بہت

دنیا کی آفتیں ہیں غریبوں کے واسطے — آندھی کا زور ہے مری شمعِ مزار پر
ہم بھی دعائیں کرتے رہے ہیں بہار کی — اے باغباں ہمارا بھی حق ہے بہار پر
گلشن میں آمد آمدِ فصلِ بہار ہے — بلبل قفس میں مارتی ہے بار بار پر
اہلِ زمانہ پر متعجب ہوں اے وفاؔ
مرتے ہیں کیوں یہ زندگیٔ مستعار پر

ہیں اور تیرا شکوۂ جور و ستم غلط — باطل۔ دروغ۔ جھوٹ خدا کی قسم غلط
کافر ترا بہانۂ دورانِ سر صحیح — لیکن مرا فسانۂ رنج و الم غلط
آخر نگاہ یارِ ندامت سے جھک گئی
ثابت نہ کر سکے وہ نشانِ قدم غلط

کس کو نصیب ہوتے ہیں پھر جلسہ ہائے ہے — جیتا ہے کون دیکھئے اگلی بہار تک
اُف رے ستم کہ بہر دعائے وصالِ غیر — وہ پاؤں چل کے آئے ہیں میرے مزار تک
تم بھی کرو نہ ہجر شب و روز اس قدر
ہم بھی گریں گے صبر گئے اختیار تک

صبر مشکل تھا محبت کا اثر ہونے تک　　جان ٹھہری نہ دل دوست میں گھر ہونے تک
شبِ فرقت کی بھی ہونے کو سحر تو ہوگی　　ہاں مگر ہم نہیں ہونیکے سحر ہونے تک
تیرا پردہ بھی اٹھا دے گی مری رسوائی　　تیرا پردہ ہے مرے خاک بسر ہونے تک

اے وفا معرکۂ عشق تو سر کیا ہوگا
ہو چکیں گے ہمیں یہ معرکہ سر ہونے تک

پامالِ آسماں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم　　مردودِ کارواں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم
یا چین سے نہ بیٹھنے دیتا تھا پائے شوق　　یا اتنا ناتواں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم
یارب یہ جلوہ گاہ ہے کس رشکِ ماہ کی　　یارب یہ میں کہاں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم

راہِ طلب میں آبلہ پائی سے اے وفا
اپنے پہ بھی گراں ہوں کہ اٹھتے نہیں قدم

اُن پہ اُمیدِ کرم رکھ اے دلِ ناشاد کم　　عشق میں ہوتی ہے ممنونِ اثر فریاد کم
آج دنیا میں اگر صیاد خوں تم سا نہیں　　پاؤ گے ہم سا بھی کوئی خوگرِ بیداد کم

کام لے فکرِ سخن میں دل سے بھی جنکا دماغ
اس زمانے میں ہیں ایسے اے وفا اُستاد کم

زبانِ بے زبانی میں حدیثِ غم بھی کہتے ہیں　　سنو اے سننے والو ہاں سنو کچھ ہم بھی کہتے ہیں
ہمیں از بر ہزاروں داستانیں ہیں زمانے کی　　سُنے کوئی تو اپنی داستانِ غم بھی کہتے ہیں

نہیں کہنے کو حاجت اے وفا زہنار موسم کی
کہ ہم کہنے پر آجائیں تو بے موسم بھی کہتے ہیں

منتظر یک نظرِ التفات　　ہم بھی کھڑے عرض گزار و نمیں ہیں
ناز تھا کل تک جنہیں تدبیر پر　　آج وہ تقدیر کے مارو نمیں ہیں
کون ہوا تیری گلی میں شہید　　تذکرے کیا راہ گزارو نمیں ہیں

لوگ لے جاتے ہیں چن چن کے پھول — اور ہم اُلجھے ہوئے خار نہیں ہیں

راہ نمائی کے زمانے گئے

راہ زن اب راہگزاروں میں ہیں

معنی طرازیاں ہیں رنگیں بیانیاں ہیں — دنیا میں جتنے منہ ہیں اتنی کہانیاں ہیں

کیا مہربانیاں تھیں کیا مہربانیاں ہیں — وہ بھی کہانیاں تھیں یہ بھی کہانیاں ہیں

اِک بار اُس نے مجھ کو دیکھا تھا مسکرا کر — اتنی سی ہے حقیقت باقی کہانیاں ہیں

سنتا ہے کوئی کس کی کس کو کوئی سنائے — ہر ایک کی زباں پر اپنی کہانیاں ہیں

کچھ بات ہے جو چپ ہوں میں سب کی سُن کے ورنہ

یاد اے وفا مجھے بھی سب کی کہانیاں ہیں

حُسن لیں جو مستِ مئے عیش ہیں ایوانوں میں — زندگی کروٹیں لیتی ہے سیاہ خانوں میں

خوفِ تخریب کا طاری ہے جہاں والوں پر — دورِ ہستی پیار کی جاری ہے جہاں بانوں میں

خونِ انساں کے نظر آتے ہیں پیاسے انساں — نام کو بھی نہیں انسانیت انسانوں میں

اے کہ ویرانوں میں گلزار کھلاتے ہو تم — اگلے گلزار بدل جائیں نہ ویرانوں میں

اے وفا دور بہت دور ہے وہ خوشحالی

جو نظر آتی ہے سرکار کے اعلانوں میں

زباں کرنا ہی جی کا روٹھنا اے سنگ دل تجھ سے — وہ جھنکور و ٹھکر کو بھی منا لے اور سہتے ہیں

زمانے کی نظر میں اک ادا ہے ظلم بھی تیرا

زمانہ جن سے بدلہ ظلم کا لے اور سہتے ہیں

غم دیدہ ہوں الم زدہ ہوں سوگوار ہوں — اک چلتا پھرتا آرزوؤں کا مزار ہوں

کہتے ہیں اس کو صبر مگر اصلیت ہے یہ — کرتا ہوں دل پہ جبر کہ بے اختیار ہوں

اک وہ خزاں بھی جس کی ہر اک رنگ بہار ہے — اک میں بہار میں بھی جو ننگِ بہار ہوں

آخر یہ اے وفا ہے سزا کس گناہ کی
کیوں نا سزائے رحمتِ پروردگار ہوں

موت علاجِ غم تو ہے موت کا آنا سہل نہیں
جان سے جانا سہل سہی جان کا جانا سہل نہیں

ہمدردی ہمدردی میں جان ہی لیکر ٹلتے ہیں
ان ظالم ہمدردوں سے جان چھڑانا سہل نہیں

برق بھی گرتی ہی اکثر خرمن بھی جلتے ہیں مگر
اپنے ہاتھوں خرمن کو آگ لگانا سہل نہیں

غم کے کھانیوالوں کو کھاجاتا ہے آخر
غم کا کھانا مشکل ہے غم کا کھانا سہل نہیں

دعوئے مجذوبیت کیا مجھ سے کرے منصور وفا
بک اٹھنا ہے سہل مگر بکنے جانا سہل نہیں

طبیعت کو مرغوب اب کچھ نہیں
سبب کیا بتاؤں سبب کچھ نہیں

عیادت کو آئے تو آئے وہ کب
مریضِ تپِ غم میں جب کچھ نہیں

کرم آپ کا اور مرے حال پر
سو پہلے بھی کیا تھا جواب کچھ نہیں

زر و دو بھی آخر کوئی چیز ہے
مقدر ہی دنیا میں سب کچھ نہیں

بھروسہ ہو دنیا پہ کیا اے وفا
توقع ہی دنیا سے جب کچھ نہیں

عام ہی کرنا پڑے گا اُن کو فیضِ التفات
غیر مرکزِ التفاتِ خاص کے قابل نہیں

منتخب ہیں ہی ہوا مشق تغافل کے لئے
وہ تغافل کیش میری یاد سے غافل نہیں

حلقۂ گرداب ہے گہوارۂ عشرت مجھے
ذوقِ آسایش مرا منت کشِ ساحل نہیں

لاکھ دل قربان اس چشمِ ندامت کوش پر
یعنی مجھ کو آرزوئے خونہائے دل نہیں

مرجعِ برقِ بلا ہے اے وفا دنیائے عشق
حاصلِ حسرت یہاں جز حسرتِ حاصل نہیں

ہائے عالم شبِ فرقت مری مایوسی کا
دیتی ہے موت کی اُمید دلاسے مجھ کو

تھا تیزی فتنہ خرامی سے عیاں دل کا مآل　　بوئے خوں آتی ہے نقشِ کفِ پا سے مجھ کو
اے وفاؔ موسمِ وحشت بھی ہے کیا موسمِ گُل
کیوں بچاتے ہیں گلستاں کی ہوا سے مجھ کو

کھاتے ہیں وہ غیروں کی قسم اور زیادہ　　مجبور ہوئے جاتے ہیں ہم اور زیادہ!
جو صورتِ جادہ کبھی اُف تک نہیں کرتے　　ہوتے ہیں وہ پامالِ ستم اور زیادہ!
وہ سامنے ہیں گنجِ شہیدوں کے نظارے　　ہاں چلئے ذرا چار قدم اور زیادہ!
دیتا ہوں وفاؔ اس ستم آرا کو دعائیں
اللہ کرے حسنِ ستم اور زیادہ

غمِ ہجر کی انتہا ہو گئی ہے　　طبیعت سکوں آشنا ہو گئی ہے
فغاں بنکے اُٹھی تھی دل سے شکایت　　مگر لب پر آکر دعا ہو گئی ہے
روا تھی نہ بے دادِ اہلِ وفا پر　　روا ہوتے ہوتے روا ہو گئی ہے
ترے رازِ الفت کو رسوا نہ کر دے
جو حالت تری اے وفاؔ ہو گئی ہے

گیا توبہ کا موسم جوشِ مستی کی بہار آئی!　　گھٹا بن کر نویدِ رحمتِ پروردگار آئی
مرے ذوقِ خلش کی شرم رکھ لی دشتِ وحشت نے　　کہ اک اک گام پر تلوؤں میں سو سو نوکِ خار آئی
یہ گریاں کس کے ماتم میں ہے شبنم آخرِ شب سے　　یہ کس کے پھول چننے کے لئے بادِ بہار آئی
نظامِ دہر بدلا گردشِ افلاک سے ایسا　　گلستاں میں چلی آندھی بیاباں میں بہار آئی
وفاؔ اس شورش آباد جہاں میں وقفِ حیرت ہوں
رہین بے خودی ہے طاقتِ ہنگامہ آرائی

چنگ و رباب سے نہ مئے خوشگوار سے　　لطفِ بہار ہے اُسی جانِ بہار سے
معمور ہو رہی ہے فضا کیوں غبار سے　　کس کو اٹھا رہے ہیں تری رہگزار سے

لانے لگی ہیں رنگ مری بے قراریاں / آنے لگے ہیں وہ بھی نظر بے قرار سے
دیکھیں تو کس کو ہے سر فریاد حشر میں / تم سب کو دیکھ لو نگۂ شرمسار سے
بیٹھے ہیں آس لگا کے ترے التفات کی / اٹھیں گے خاک ہو کے تری رہگزار سے

ٹوٹی نہ آس وعدۂ فردا کی اے وفا
چھوٹی نہ جان کشمکشِ انتظار سے

دیارِ حسن میں پابندیٔ رسمِ وفا کم ہے / بہت کم ہے بہت کم ہے بحدِ انتہا کم ہے
جفائے بے سبب کم ہے کہ جورِ ناروا کم ہے / تری بیداد لے ظالم نہ ہونے پر بھی کیا کم ہے
کمالِ دلبری میں کون سی تیری ادا کم ہے / نہ شوخی کم حیا سے ہے نہ شوخی سے حیا کم ہے
خدا کے نام پر دست دگر بار ہیں خدا والے / بہت ہے جس قدر ذکرِ خدا خوفِ خدا کم ہے
دعا کو ہاتھ کیوں اٹھے مرے تیمار داروں کے / زباں سے کچھ نہیں کہتے کہ امیدِ شفا کم ہے
کرو تکلیفِ شرکت کس لئے میرے جنازے میں / گھڑی بھر کو عزادارو تمہیں آ بیٹھو تو کیا کم ہے

رہے بدظن نہ کیوں کر حضرتِ شہ حسن اے وفا مجھ سے
بڑا نادان ہے سنتا بہت ہے دیکھتا کم ہے

آنکھ سے دیکھا ہے کیا کیا کچھ بیاں کیا کیجئے / اک جہاں کو درپئے آزارِ جاں کیا کیجئے
باغِ ہستی میں کہ طوفانِ شدائد ہے بپا / زحمتِ عزمِ بنائے آشیاں کیا کیجئے
ہر کسی سے شکوۂ اہلِ جہاں کا فائدہ / ہر کسی سے شکوۂ اہلِ جہاں کیا کیجئے
کیجئے خود ہی سبیلِ ابتدائے انقلاب / انتظارِ انقلابِ آسماں کیا کیجئے

مہربانی رحم کا ہے دوسرا نام اے وفا
مہربانی پر محبت کا گماں کیا کیجئے

بڑا بیدادگر وہ مہ جبیں ہے / مگر اتنا نہیں جتنا حسیں ہے
جہاں میں امن ہو کیوں کر کہ ہر سو / بپا جنگِ بقائے بہتریں ہے

نہیں کا لفظ ہے کچھ تلخ ورنہ — تمہاری ہاں کا بھی مطلب نہیں ہے

ترے مہمان وہ آئیں اسے وفا کیا

ارے تیرا ٹھکانہ بھی کہیں ہے!!

دل جو گیا تو کیا ملال اس کی تلاش کیا ضرور — جس نے چرایا ہے اسے وہ تو مری نظر میں ہے

حالِ مریضِ عشق غیر رات پہاڑ ہجر کی — آئے ہی گی سحر مگر فرق سحر سحر میں ہے

دیکھی جن کو تھا غرور انکو ہے مجھ سے اب حسد

یہ بھی تو آخر اے وفا عیب ترے ہنر میں ہے

زندگی خاک میں کبھی تھی ترے دیوانے سے — اب اٹھے گا بگولا کوئی ویرانے سے

جل مرا آگ محبت کی اسے کہتے ہیں — جل نہ دیکھا نہ گیا شمع کا پروانے سے

شیخ صاحب بھی ہوئے معتقد پیر مغاں — آج یہ تازہ خبر آئی ہے میخانے سے

اے وفا اپنے بھی جب آنکھ چرا لیتے ہیں!

بے رخی کا ہو گلہ کیا کسی بیگانے سے

دن جدائی کا دیا وصل کی شب کے بدلے — لینے تھے اے فلک پیر یہ کب کے بدلے

راحتِ وصل کسی کو تو کسی کو غم ہجر — صبر خالق نے دیا ہے مجھے سب کے بدلے

اتنی سی بات پہ بگڑے ہی چلے جاتے ہو

لے لو تم بوسہ لب بوسہ لب کے بدلے

التفاتِ عام ہے وجہ پریشانی مجھے — کس قدر مہنگی پڑی ہے ان کی ارزانی مجھے

بحر ہستی ہے مری نظروں میں اک دشت سراب — ریت کا ہوتا ہے دھوکا دیکھ کر پانی مجھے

سعی بیجا تھی دل کی کوششِ اخفائے راز — کر گئی رسوا نگاہوں کی پریشانی مجھے

یا عدو کے بوالہوس کی ناز برداری کرو — یا بنا لو تختہ مشق ستم رانی مجھے

کھل نہیں سکتی فقط اک آپ کے دل کی گرہ — ورنہ کیا کیا گتھیاں آتی ہیں سلجھانی مجھے

کس قدر ناپید ہیں اہلِ کمال اب اے وفاؔ
کوئی اپنا بھی نظر آتا نہیں ثانی مجھے

جب بہار آئی ہے زنجیر بپا رکھا ہے
اقربا نے مجھے دیوانہ بنا رکھا ہے

ہم سخن غیر سے رہنا ہے قرینِ اخلاق
مجھ سے کم بولنے کا نام حیا رکھا ہے

روز ہوتی ہے ہزاروں ہی گھروں میں شبِ غم
شمع رویوں نے بھی اندھیر مچا رکھا ہے

داغِ حسرت کہ ہے ویرانۂ دل میں روشن
مردہ امیدوں کی تربت پہ دیا رکھا ہے

بزم میں داد نہ دینا ہے خلافِ آداب
اے وفاؔ ورنہ ترے شعروں میں کیا رکھا ہے

بے بس ہوں اشتیاقِ دلِ بے قرار سے
اب لاش ہی اُٹھے گی مرے کوئے یار سے

اتنی ہی بڑھ رہی ہے عدو کی شبِ وصال
گھبراؤں کیوں نہ طولِ شبِ انتظار سے

لغزش نہ آسکی مرے ایمانِ عشق میں
کعبہ مجھے نہ کھینچ سکا کوئے یار سے

بیگانۂ خرد نہیں دیوانگی مری!
دامن کو سی رہا ہوں گریباں کے تار سے

لب پر تبسم آنکھ لجائی ہوئی سی ہے
یہ بات کیا ہے کہ بنائی ہوئی سی ہے

ملتی ہے کس سے آپ بھی فرمائیے قیاس
اک شکل میرے دل میں سمائی ہوئی سی ہے

ترے وصال میں مرنا بھی کچھ محال نہ تھا
ترے فراق میں جینا بھی ہے وبال مجھے

غمِ فراق شدید اس قدر نہ تھا پہلے
دعا ہے اب نہ ملے راحتِ وصال مجھے

اگر عدو سے تجھے واقعی محبت ہے
تو امتحان میں لے بدگمان نہ ڈال مجھے

تری خوشی ہو عدو کی خوشی کے تابع کیوں
تری خوشی کا بھی ہونے لگا ملال مجھے

کبھی جو اس نے اجازت سوال کی دی ہے
جواب دے گئی ہے طاقتِ سوال مجھے

میں ناز کیوں نہ کروں اپنی بے کمالی پر
کہ اے وفاؔ نہیں اندیشۂ زوال مجھے

اُف رے مآلِ حسرتِ تعمیر آشیاں   جس شاخ پر نگاہ تھی وہ شاخ جل گئی
ظاہر میں دیکھنے کو ہے دُنیا وہی مگر   اصلیت اب یہی ہے کہ دنیا بدل گئی

کس روز غیر سے نہ لڑی وہ نگاہِ ناز
کس روز اے وفاؔ نہ چھری دل پہ چل گئی

مجھے آب و ہوائے باغ راس آتی تو کیا آتی
مری تقدیر میں تھے خانۂ صیاد کے ٹکڑے

اُڑی جاتی ہے خاقت بے تحاشہ کوئی قاتل کو
اُڑائے جائیں گے اک نشاکِ بیداد کے ٹکڑے

انہی پر داستانیں بن گئیں فرہاد و مجنوں کی!
زباں زد تھے جو میرے عشق کی رُوداد کے ٹکڑے

ابھی دردر کی مجھ کو ٹھوکریں کھانی ہیں دنیا میں
ابھی تقدیر میں ہیں اس خراب آباد کے ٹکڑے

یہ شاگرد آج کل کے توبہ توبہ اے وفاؔ توبہ
اُڑا ڈالیں جو بس اُن کا چلے اُستاد کے ٹکڑے

الٰہی کس قیامت کے مرے نالے رسا نکلے   نہ تحت السّریٰ پہنچے سر فوق السّما نکلے
بوقتِ گریہ پاسِ اضطرابِ قلب لازم ہے   جو آنسو آنکھ سے نکلے تڑپتا ٹوٹتا نکلے
کبھی پردے میں رہ سکتی نہیں شہرت حسینوں کی   جو پردے میں رہا کرتے تھے عالم آشنا نکلے

محبت کی ہے شاید اے وفاؔ اک یہ بھی مجبوری
بھرے ہوں دل میں تو شکوے مگر منہ سے دُعا نکلے

نہ کھیلا جائے گا کیا بے بسی میں جان پر مجھ سے
ذرا بھی ہے اگر دل میں خدا کا ڈر تو ڈر مجھ سے
نزاہت میں اُتر آتے ہیں آخر نامہ بر مجھ سے
لگا دیتے ہیں کچھ کی کچھ اُدھر مجھ سے اِدھر مجھ سے
رہیں بیٹھے ہوئے وہ تمکنت سے بزمِ دشمن میں
مری تعظیم کو اُٹھ اُٹھ کے ملتی ہے نظر مجھ سے
ہنسی آتی ہے ان کی سادگی پر لے وفا مجھ کو
جو رکھتے ہیں توقع جز دعائے بے اثر مجھ سے
شبِ غم چھپایا جاتا ہے دھواں آہوں کے شعلوں کا
ستارے ٹوٹتے ہیں رات کالی ہوتی جاتی ہے
اُمیدیں آتی ہیں آ آ کے دل سے نکلی جاتی ہیں!
یہ وہ بستی ہے جو بس بس کے خالی ہوتی جاتی ہے
وہ سن کر حالِ فرقت ہو گا کہتے جاتے ہیں!
کہانی میری ماضی اضمحلالی ہوتی جاتی ہے
محبت بھی ہوا کرتی ہے دل بھی دل سے ملتا ہے
مگر پھر آدمی کو آدمی مشکل سے ملتا ہے
عجب رقّت فزا ہے آخری ملنے کا نظارہ
گلے لگ لگ کے بسمل خنجرِ قاتل سے ملتا ہے
سرائے دہر میں تانتا بندھا ہے کاروانوں کا
عدم کا اے وفا رستہ اسی منزل سے ملتا ہے
کبھی اُٹھتا ہے دردِ دل کبھی غش ہم پہ طاری ہے

کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے عجب حالت ہماری ہے
غضب کی ناتوانی ہے بلا کی بے قراری ہے

ترے بیمار پر آج اے مسیحا رات بھاری ہے
کوئی کچھ کوئی کچھ سب اپنی اپنی کہتے ہیں لیکن

ہماری موت کا باعث تری غفلت شعاری ہے
سکون انجام ہو جاتا ہے بڑھنا بے قراری کا

علاج بے قراری انتہائے بے قراری ہے
کوئی آفت نہیں بڑھ کر پریشاں روزگاری سے

ہزار آفت کی اک آفت پریشاں روزگاری ہے
کوئی تو حد ہو آخر اے وفا بے اختیاری کی

نہ جینا اختیاری ہے نہ مرنا اختیاری ہے

نیرنگ چرخ شعبدہ گر کچھ نہ پوچھئے — کیا ہو رہا ہے شام و سحر کچھ نہ پوچھئے
سب کے نصیب میں نہیں گلگشت کوئے دوست — دل شادی نسیم سحر کچھ نہ پوچھئے
اندازہ نشاط ملاقات کیجئے — خمیازہ نشاط مگر کچھ نہ پوچھئے
طوفان انتشار کی شدت خدا پناہ — بھٹکا گیا ہے کون کدھر کچھ نہ پوچھئے
جس کا کچھ آسرا نہ ہو اس راہ سیار کا — عالم قریب ختم سفر کچھ نہ پوچھئے

کس کی گلی میں پائے گئے خون کے نشان
آئی کہاں سے دل کی خبر کچھ نہ پوچھئے

صبح ہوتا ہے شام ہوتا ہے — خون ناحق مدام ہوتا ہے
خوف آتا ہے جس کو مرنے سے — اس کا جینا حرام ہوتا ہے
جینے والے بھی مر ہی جاتے ہیں — مرنے والوں کا نام ہوتا ہے

کیا کلام اس کی خوش نصیبی ہیں جس سے تو ہم کلام ہوتا ہے
آمد آمد ہے اے وفا کس کی
آج کیا اہتمام ہوتا ہے

ہجر کی بھی رات بسر ہو گئی ہو تو نہ سکتی تھی مگر ہو گئی
آئینہ ہے پیش نظر رات دن تم کو تمہاری ہی نظر ہو گئی
میری عبادت کو کون آ گیا سب کی نظر جانبِ در ہو گئی
دیر مری جان کے جانے کی تھی جان گئی اور سحر ہو گئی
موقفِ مصیبت رہے ہم عمر بھر
عمر مصیبت میں بسر ہو گئی

مری فریاد ممنونِ اثر مشکل سے ہوتی ہے مری جانب عنایت کی نظر مشکل سی ہوتی ہے
ہمارے حال پر اُن کی نظر مشکل سے ہوتی ہے ہمارے حال کی اُن کو خبر مشکل سے ہوتی ہے
نہیں ہاں ہاں نہیں آساں بسر کرنا شبِ غم کا شبِ غم اے دلِ ناداں بسر مشکل سے ہوتی ہے
گزر جاتی ہیں راحت کی تو سو عمریں بآسانی گھڑی بھی اک مصیبت کی بسر مشکل سے ہوتی ہے
یہ دردِ عشق ہے یہ جاں ہی کے ساتھ جائے گا دوا اس درد کی اے چارہ گر مشکل سی ہوتی ہے
کہیں کیا ہم بسر ہوتی ہے کیسے زندگی اپنی
خلاصہ اے وفا یہ ہے بسر مشکل سے ہوتی ہے

متفرقات

باہم تجھے بے پردہ اے رشکِ قمر دیکھا دیکھا تو نہ جاتا تھا ناچار مگر دیکھا
داد کے قابل تھا میرا ضبطِ الفت بزم میں راز افشا تیری دزدیدہ نگاہوں نے کیا
غریبوں کی نہیں جن میں رسائی اُن ایوانوں کو اب ڈھانا پڑے گا

ہمیں بکتے چلے جائیں گے کب تک — تمہیں بھی کچھ تو فرمانا پڑیگا

وہ بولے مری نعش کو دیکھ کر — زمانہ بڑا بے وفا ہو گیا

میں مٹ گیا تو گردشِ دوراں بھی تھم گئی — میرے ہی واسطے ستم روزگار تھا

چلا آیا ہے میخانے میں تو خالی نہ جا واعظ — ادھر آ کچھ عمامہ رہن رکھ کچھ دام لیتا جا

طریقِ عرضِ مطلب اے وفا اس بزم میں یہ ہے — زباں کو بند رکھ اور ہچکیوں سے کام لیتا جا

لیجئے چل کے کچھ وفا سے صلاح — اس نے دیکھے ہیں انقلاب بہت

پھر مجھے آرزوئے زیست ہوئی ہے پیدا — یاد آئی ہے انہیں قدرِ وفا میرے بعد

وہ پھر فاتحہ آ کے بیٹھے ہیں مدفن پر — مجھے خونِ جگر رونا پڑا ہے مرگِ دشمن پر

امیدِ وفا وفا بتوں سے — اے مردِ خدا خدا خدا کر

کہے اہلِ دولت سے کون اے وفا — کہ دولت ہی دنیا میں سب کچھ نہیں

قیامت کا اٹھانا ہے اٹھانا ان کا کوچے سے — یہ دیوانے تمہارے جو تماشا بن کے بیٹھے ہیں

اتر جاتی ہیں جو دل میں جلا دیتے ہیں جو دل کو — وہ آہیں اور ہوتی ہیں وہ نالے اور ہوتے ہیں

جگر کی بیکلی دل کی تڑپ سونے نہیں دیتی — شبِ فرقت لئے بیٹھا ہوں دو بیمار پہلو میں

بندوں کے ستم بندوں پہ اے میرے خدا دیکھ — ہوتا ہے خدائی میں تری آج یہ کیا دیکھ

گھڑی بیمارِ غم کی آ گئی کیا تم نہ آؤ گے — اداسی بام و در پہ چھا گئی کیا تم نہ آؤ گے

جان پہ کھیلنا مشکل ہے مگر یاد رہے — کھیلنے پر کوئی آ جائے تو آسان بھی ہے

بھلا جس بزم میں غیروں کی پگڑی بکتی رہتی ہو — وہاں کب اے دلِ ناداں ہماری دال گلتی ہے

اب رویہ حضور کا کیا ہے — اللہ کیا خفگی انتہا کیا ہے

پایا نہ ہم نے لطف کوئی دن بہار کا — یوں بیتنے کو بیت گئے دن بہار کے

کب سے رکا کھڑا ہے جنازہ شہید کا — بیٹھے بھی تم ابھی نہیں زلفیں سنوارنے

وہ نامرادِ ذوقِ خلش ہوں کہ دشت میں — کانٹے ہیں سرنگوں مرے چھالوں کے سامنے

گیارھواں باب

کتابیات

کتابیں جن سے ان مقالات کی تیاری میں مدد لی گئی :-

	کتاب	مصنف
۱	شعر العجم حصہ دوم۔ سوم۔ چہارم	مولانا شبلی
۲	شعر الہند حصہ اول و دوم	مولانا عبدالسلام ندوی
۳	گلِ رعنا	مولانا حکیم عبدالحئی
۴	بزم تیموریہ	سید صلاح الدین عبدالرحمن ایم اے
۵	اُردو زبان و ادب	ڈاکٹر مسعود حسین خاں
۶	تاریخِ ادب اُردو	ڈاکٹر سید اعجاز حسین
۷	غزل اور مطالعہ غزل	عبادت بریلوی
۸	دَورِ حاضر اور اُردو غزل گوئی	عندلیب شادانی
۹	جدید غزل	پروفیسر رشید احمد صدیقی
۱۰	ہماری شاعری	پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب
۱۱	مقدمہ شعر و شاعری	مولانا حالی
۱۲	یادگارِ غالب (اردو)	مولانا حالی - مرتبہ مالک رام
۱۳	کیفیہ	پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی
۱۴	فکر و فن	پروفیسر خلیل الرحمن اعظمی
۱۵	نظر اور نظریے	پروفیسر آلِ احمد سرور
۱۶	چند ہم عصر	ڈاکٹر مولوی عبدالحق

۱۷	تذکرۂ جگر	محمود علی خاں ۔ جامعہ ملیہ
۱۸	اردو شاعری کے ارتقا میں ہندو شعرا کا حصہ	گنپت سہائے سریواستو ۔ ایم اے
۱۹	مقالاتِ احسان	مرزا احسان احمد
۲۰	سرور جہاں آبادی ۔ حیات اور شاعری	ڈاکٹر حکم چند نیر
۲۱	تلوک چند محروم	ڈاکٹر جگن ناتھ آزاد
۲۲	جگر بریلوی	ڈاکٹر سیفی پریمی
۲۳	منور لکھنوی	راج نارائن راز
۲۴	شاد عارفی ۔ فن اور شخصیت	مظفر حنفی
۲۵	نقدِ میر	ڈاکٹر سید عبد اللہ
۲۶	رمزِ اقبال	ڈاکٹر سید عبد اللہ
۲۷	اطرافِ غالب	ڈاکٹر سید عبد اللہ
۲۸	نقدِ غالب	ڈاکٹر مختار الدین احمد
۲۹	سدا بہار پھول ۔ وفا صاحب کے شوخیِ عطف و اضافت اشعار کی تشریح	مرتبہ دیس راج سوہل منکر
۳۰	نقشِ اقبال	،،
۳۱	اصلاحِ سخن	اسلوب احمد انصاری
۳۲	مشاطۂ سخن	شوق سندیلوی
۳۳	آئینۂ اصلاح	صفدر مرزاپوری
۳۴	انتقادیات	جوش ملسیانی
۳۵	تنقیدات عبد الحق	نیاز فتحپوری
		مرتبہ محمد تراب علی خاں باز

دواوین

۱	انتخاب میر — مولوی عبدالحق	۸	کلیات اقبال
۲	دیوان آتش	۹	کلیات حسرت موہانی
۳	دیوان غالب	۱۰	کلیات فانی
	دیوان ذوق	۱۱	کلیات جگر
۴	کلیات مومن	۱۲	گلبانگِ فراق
۶	گلزار داغ	۱۳	کلامِ اصغر
۷	آفتاب داغ	۱۴	سنگِ میل — پنڈت میلارام وفا

اردو رسائل جن سے استفادہ کیا گیا

۱	نقوشِ لاہور	شخصیت نمبر
۲	جاں نثار امرتسر	اگست ۶۹ء تا دسمبر ۷۱ء
۳	تحریک دہلی	بسمل سعیدی نمبر